افادات فاضلیہ جلد اوّل

مکالمات

تقدس مآب سلطان الحقیقت شیخ الامت اعلٰے حضرت فضل شاہ صاحب

مرتّب

علّامہ ارشد

حافظ نذرالاسلام

نگران

ابو مُسلم صحافی

ادبستان ۰ لاہور

توجّہ طلب

- یہ کتاب تبلیغی نوعیت کی ہے۔ اس میں کاروباری نقطۂ نگاہ کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ لہذا اس کی قیمت اصل لاگت کے مطابق رکھی گئی ہے۔

- اگر اس کتاب میں درج شدہ مضامین کے سلسلہ میں کوئی استفسار کرنا مقصود ہو تو صاحبِ کتاب سے اس پتہ پر رجوع فرمایا جائے۔
تقدس مآب اعلٰے حضرت سلطان الحقیقت شیخ الامت فضل شاہ صاحب ۔ آستانہ قادری، عرف فوروالو کا ڈیرہ۔ انفنٹری روڈ۔ دھرم پورہ، لاہور

ناشر

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت: اوّل
سال: ۱۹۶۸ء
قیمت: روپے -/۴
کتابت: ثریا رقم
طابع
آفتاب عالم پریس، لاہور
ناشر
ادبستان ○ لاہور

تبلیغی ایڈیشن

لمحۂ فکریہ

○

اگر مسلمان جلوت و خلوت میں اپنی مرکزیت قائم نہ کر سکے تو خداوند تعالیٰ بھی ان کے زوال کو روکنا پسند نہیں فرمائے گا۔ اور یہ کام ملّت کے صاحبانِ حال ہی کر سکتے ہیں۔ صاحبانِ قال نہیں۔ کاش! ہر مسلمان کی سمجھ میں وحدتِ فکر کی اہمیت آجائے۔

(حضرت سلطان الحقیقت)

ترتیب

موضوع	ضمنی وضاحات یا استفسارات	صفحہ
ایّام درویش	(سوانح حیات)	۲۳-۲
حرفِ گفتنی	(مقدمہ)	۵۶-
تمہید		۶۳

استفسارات وجوابات:

(ا) اسلام اور ملکیت

- اسلام میں ملکیت کا تصور کیا ہے؟ ۲

(ب) اللہ اور بندے کا تعلق

- اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام کیا ہے؟ ۴
- اللہ تعالیٰ سے پاک رہنا کیا معنی رکھتا ہے؟
- اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیسے پاک رہا جا سکتا ہے؟ ۹
- اللہ تعالیٰ کے بندے کی تعریف کیا ہے؟ ۹۷
- اگر طبیعت عبادت کی طرف مائل نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ ۱۱۴
- ایاک نعبد وایاک نستعین کی تشریح کیا ہے؟ ۱۱۶
- بندگی کی شرط کیا ہے؟ ۹۹
- شرک خفی کیا ہے؟ ۸۶
- کیا اللہ تعالیٰ مسلم اور غیر مسلم نیک انسانوں میں تمیز روا رکھتا ہے؟ ۷۶
- قلوب المومنین کو عرش اللہ تعالیٰ کیوں کہا گیا ہے؟ ۸۹
- کیا برے آدمی سے دور رہنا ہی بہتر ہے؟ ۸۳
- کبریا سے ملنے کا کیا طریقہ ہے؟ ۷۸
- گناہ کی تشریح کیا ہے؟ ۸۳

- اہلِ حق کے نزدیک سچے کی پہچان کیا ہے؟ ۱۰۱
- اہلِ حق کے نزدیک طمع کیا ہے؟ ۱۰۳
- اہلِ حق کے نزدیک مرد کی تعریف کیا ہے؟ ۹۲
- بے حقیقت کون ہوتا ہے؟ ۱۱۴
- باحقیقت کون ہوتا ہے؟ ۱۱۴
- حق تک پہنچنے کے لئے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے؟ ۸۶
- حق و باطل میں امتیاز کیا ہے؟ ۱۱۴
- حقائق کی ابتداء کیا ہے؟ ۷۵
- راہِ حقیقت میں نیستی کیا ہے؟ ۱۱۴
- عام لوگوں اور اہلِ حق میں کیا فرق ہے؟ ۱۰۲
- بزرگانِ دین سے کیا طلب کیا جائے؟ ۱۱۰
- بزرگانِ دین کی نظر میں عقیدہ کیا ہے؟ ۱۰۲
- بزرگانِ دین کن لوگوں کو تحفظ دیتے ہیں؟ ۸۷
- کیا بزرگانِ دین کا خیالی تصور باندھنا چاہئے؟ ۱۰۴
- مخلوق کی کتنی قسمیں ہیں۔ اوران کے متعلق بزرگانِ دین کی کیا رائے ہے؟ ۹۱

(د) تبلیغِ حق

- افہام و تفہیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟ ۸۳
- اگر طبیعت عبادت کی طرف مائل نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ ۱۱۴
- اوراد و وظائف زیادہ ضروری ہیں یا نیت کی صفائی؟ ۱۱۵

• کلام کرتے وقت کیا احتیاط برتی جائے؟ ۸۴

(ز) تقدیر

• تقدیر کے متعلق بزرگانِ دین کی کیا رائے ہے؟ ۱۰۷

• ستاروں کا تقدیر سے کیا تعلق ہے؟ ۱۰۸

(ح) جماعت اور فرد

• جماعت اور فرد کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ۹۳

(ط) جمال کی تعریف

• جمال کی کیا تعریف ہے؟ ۱۲۲

(ی) حجاب

• حجاب کی کیا تعریف ہے؟ ۹۲

• کیا طلب ایک حجاب ہے؟ ۱۱۰

(ک) دین اور دُنیا

• دنیا کے کیا معنی ہیں؟ ۱۰۸

• دین اور دنیا میں کیا فرق ہے؟ ۷۹

• کیا مادی تقاضوں کو نظر انداز کر کے دین کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں؟ ۱۱۶

• دین کے لئے دانش کس قدر ضروری ہے؟

• سلامتی میں کیسے رہا جا سکتا ہے؟ ۹۴

(ل) سُود

• سُود لینا یا دینا کیوں منع ہے؟ ۱۱۳

(م) شکریہ اور شکر

• نعمت کا شکریہ کس طرح ادا ہونا چاہئے؟ ۸۰

• اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ کس طرح اور کیوں ادا کرنا چاہئے؟ ۹۰

(ن) علم وعمل

• اعمال کی روح کیا ہے؟ ۴۸

اعمال کی شرح کیا ہے؟ ۹۹

• جب محب کو علم عطا ہو جاتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ ۱۰۹

- جب جنتی اور دوزخی ہونے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ تو پھر عمل پر کیوں زور دیا گیا ہے؟ ۹۴
- حقیقی علم کیا ہے؟ ۹۰
- علم اور محبت کا درجہ کیا ہے؟ ۹۱
- علم الٰہی کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ ۸۹
- علم حقیقی پیدا ہونے سے کیا کیفیات وارد ہوتی ہیں؟ ۹۳
- علم حقیقی کب عطا ہوتا ہے؟ ۸۱
- علم کے کتنے مقام ہیں؟ ۹۰
- کرم کیا چاہتا ہے۔ عمل یا احترام؟ ۱۰۳
- کیا اہلِ ہوس میں بھی علم جلوہ گر ہو سکتا ہے؟ ۹۳
- کیا اللہ تعالیٰ نے اسباب کی عدم موجودگی میں بھی انسان کو عمل کیلئے مکلف کیا ہے؟ ۱۱۹
- کیا بزرگانِ دین کے لئے کتابی علم ضروری ہے؟ ۱۰۸

(س) طلب یا محبّت

- طلبِ صادق سے کیا مراد ہے؟ ۸۰
- محبّت میں ادب کا مقام کیا ہے؟ ۱۰۰
- محبّت میں محب کا مقام کیا ہے؟ ۹۳
  کیا وہ اپنی صورت رکھ سکتا ہے؟
- حجاب کی تعریف کیا ہے؟ ۹۲

(ع) قرآن و سنّت

- بزرگانِ دین کی نظر میں عقیدہ کیا ہے؟ ۱۰۲
- قرآنِ حکیم سات حروف پر اتارا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ ۹۴
- قرآن شریف اور حدیث شریف میں فرق کیا ہے؟ ۹۶
- قرآن فہمی کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ ۱۱۹
- قرآن حکیم باعتبار ماضی، حال اور مستقبل؟ ۹۰۰

(ن) کشمکشِ حیات

- خودی، تکبّر، مان اور گمان انسان سے کس طرح ختم ہو سکتے ہیں؟ ۱۱۱
- دنیاوی تکالیف کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ ۷۷
- دنیاوی تکالیف کن اسباب کا نتیجہ ہیں؟ ۷۷
- زندہ رہنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ ۱۱۲
- مخلوق سے حسنِ سلوک کا کیا طریق ہونا چاہئے؟ ۸۴
- معصیت سے بچنے کی صورت کیا ہے؟ ۹۴
- ناموافق حالات میں کیسے زندگی بسر کرنی چاہئے؟ ۷۶

(ص) مدارجِ انسانی

- آدمی میں انسانیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ ۷۸
- انسان کو جو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے اس کا شرف کیا ہے؟ ۷۶
- انسانیت کی معراج کس عمل سے شروع ہوتی ہے؟ ۸۰
- اہلِ حق کے درجات کیا ہیں؟ ۹۲
- اہلِ حق کے نزدیک مرد کی تعریف کیا ہے؟ ۹۲
- توبہ کا کیا مقام ہے؟ ۱۱۱
- حقیقت کی رُو سے اہلِ خیر اور رسائل کا مقام کیا ہے؟ ۹۲
- صاحبِ قال اور صاحبِ حال میں کیا فرق ہے؟ ۸۹
- فرشتے اور انسان میں کیا فرق ہے؟ ۱۰۳
- فضیلت کس چیز میں ہے؟ ۹۸
- گریہ وزاری کا مقام کیا ہے؟ ۷۸
- مصائب و آلام کا انسانی زندگی میں کیا مقام ہے؟ ۱۰۵

- منصب کیسے عطا ہوتا ہے؟ ۹۴
- مقام دوام کیا ہے؟ ۱۰۲

(ق) معتزلہ

- خواجہ حسن البصریؒ کے سکوت کا سبب کیا تھا اور معتزلہ کی حقیقت کیا ہے؟ ۱۲۴-۱۳۳

(ر) موت وحیات

- مردہ اور زندہ کی تعریف کیا ہے؟ ۷۵
- موت وحیات میں فرق کیا ہے؟ ۱۰۱

(ش) مومن، کافر اور فاسق

- فاسق کی تعریف کیا ہے؟ ۹۵
- مومن اور کافر کی پہچان کیا ہے؟ ۷۸
- مومن کے اوصاف کیا ہیں؟ ۸۷
- مومن کس شان کا حامل ہے اور حسن ایمان کیا ہے ۹۷

(ت) نفس

- بزرگانِ دین کے نزدیک کیا نفس کشی جائز ہے؟ ۹۶
- نفسِ امارہ، نفس لوامہ اور نفسِ مطمئنہ کن محرکات کا نتیجہ ہوتے ہیں؟ ۱۱۵
- نفس کی تعریف کیا ہے؟ ۹۶

(ث) ہادی اور ھدایت

- اللہ تعالےٰ کے رسول کے ساتھ کیسے باوضو رہا جائے ۸۷
- سلامتی میں کیسے رہا جاسکتا ہے؟ ۹۴
- قرآن اور سنت کی موجودگی میں ہادی کی کیا ضرورت ہے؟ ۷۹
- ہدایت کہاں سے ملتی ہے اور اس کی صورت کیا ہے ۸۸

(خ) متفرقات

- چند دوسری نوعیت کے سوالات۔ ۱۲۳
- ایک تاریخی استفسار (معتزلہ) ۱۲۴-۱۳۳
- اس دور میں تبلیغِ حق کیسے کی جائے؟ وقت کا ایک اہم سوال ۱۴۶-۱۵۲
- تاثرات (اکمل علیمی صاحب چیف رپورٹر امروز، لاہور) ۱۳۴-۱۴۵
- ملفوظات (اقوال حضرت سلطان الحقیقت) ۱۵۴
- انجام کار (قول) ۱۶۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ

○

اگر ہاتھ ، ایمن اور زبان برائیوں سے پاک رہے تو حق
کی طرف سے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ
کا وعدہ بغیر کسی تاخیر کے پورا کر دیا جاتا ہے۔

○

اعلحضرتؒ سلطان الحقیقت کا ایک قول

ترجمہ ○ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

○ ○ اگر تم مومن ہو گے تو سر بلند کر دیئے جاؤ گے۔

ایّام درویش

سوانح تقدس مآب سلطان الحقیقت شیخ الامّت اعلی حضرت فضل شاہ صاحب

اقتضائے وقت

○

کشتیاں سب پار لگانیوالی ہیں۔ ایک پر تو چڑھنا ہی پڑے گا۔ اگر بے حقیقت کا ساتھ ہوگا تو خود بھی بے حقیقت ہو جاؤ گے اور اگر با حقیقت کا ساتھ ہوگا تو با حقیقت ہو جاؤ گے۔

○

(اعلیٰ حضرت سلطان الحقیقت)

○

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردہ سے انسان نکلتے ہیں

زاد و بوم

آپ کے آباؤ اجداد دسوہہ، ضلع ہوشیارپور کے رہنے والے تھے۔ لیکن آپ کی پیدائش اُنتیسویں صدی کے آخر میں پنجاب کے مردم خیز خطہ جالندھر میں ہوئی۔ پہلے آپ بوڑہ دروازہ میں قیام پذیر رہے اور بعد میں نئے ہسپتال کے پیچھے محلہ سراج گنج میں اُٹھ آئے تھے۔ تقسیمِ ملک تک آپ کا قیام وہیں رہا۔

والدین

آپ کے والدِ ماجد کا نام حضرت نبی بخش رحمۃ اللہ علیہ تھا۔ آپ درویشانہ صفات کے حامل تھے۔ اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تقریباً ساری آمدن مساکین اور غربا پروری پر صرف ہوتی تھی۔ آپ حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ آپ اکثر اپنے ہونہار فرزند کو اپنے مرشد کی خدمتِ اقدس میں لے جایا کرتے تھے۔

حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ چشتیہ کے بہت بڑے صاحب ارشاد

بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ کا مزارِ مبارک نئی بستی کے قریب قبرستان سید گبیر، جالندھر میں ہے۔

تقدس مآب سلطان الحقیقت حضرت فضل شاہ صاحب مدظلہ کے چہرۂ انور سے بچپن ہی سے غیر معمولی سنجیدگی اور متانت مترشح تھی۔ اور پیشانیِ مبارک سے رشد و ہدایت کا نور ضیا پاش تھا۔ حضرت شاہ محمد غوثؒ جب آپ کو دیکھتے تو گود میں اٹھا لیتے اور فرماتے "یہ میرا بیٹا فیضی شاہ ہے، یہ میرا دلبند ہے، یہ میرا پیارا فیضی شاہ ہے"۔ تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت جس شے پر پسندیدگی سے نظر رکھ دیتے حضرت غوثؒ وہ آپکے والدِ ماجد کو مرحمت فرما دیتے۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ عظیم مائیں عظیم فرزندوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ قول حضرت تقدس مآب سلطان الحقیقت دام مجدہٗ کی والدہ ماجدہ پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ آپ بھی درویشانہ صفات کی حامل تھیں آپ نے تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت کی تربیت کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ اپنے جگر گوشہ کے لئے دستر خوان بچھاتیں تو محلہ کے دوسرے بچوں کو ضرور ساتھ بٹھا دیتیں۔ مقصد یہ ہوتا کہ صغر سنی ہی سے آپ کو مہمان نوازی، تواضع اور مروّت کا سبق ازبر ہو جائے۔

ایامِ طفولیت

آپ لڑکپن ہی سے حد درجہ کے خلیق اور ملنسار تھے۔ آپ کی گفت و شنید نشست و برخواست اور چال ڈھال ایک غیر معمولی شخصیت کی نشاندہی کر رہی تھی۔ کبھی آپ نے بچوں کے ساتھ بیہودہ لہو و لعب میں حصہ نہیں لیا۔ اپنا اکثر وقت مسجد میں گذارتے تھے یا پھر گھر سے باہر دور کسی ویرانہ میں نکل جاتے تھے۔ جیب میں جو کچھ ہوتا غریب بچوں یا مساکین میں تقسیم

کر دیتے۔

بچپن کے ساتھی

یہ حسنِ اتفاق ہے۔ کہ آپ کو جو لڑکپن کے ساتھی ملے وہ بھی بڑے ہو کر صاحبِ مقام بزرگ ہو گئے ہیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر جناب حضرت نیاز احمدؒ صاحب ہر دم، حضرت محمود یٰسین صاحب سجادہ نشین اور حضرت خلیفہ محمدؒ یوسف صاحب ہیں۔ یہ سب اللہ والے ایک ہی محلہ میں رہتے تھے اور ایک ہی ساتھ بڑھے پلے ہیں۔

تعلیم

آپ کا مکتب سے بہت کم تعلق رہا ہے۔ چند دن محلہ کی مسجد میں جا کر چھوڑ دیا اور اُس درسگاہ میں داخل ہو گئے جس میں تمام اہلِ دل ہوا کرتے ہیں۔ اور انہیں کبھی رخصت نہیں ملا کرتی ؎

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

حلیۂ مبارک

آپ کا چہرۂ مبارک بیضوی اور گولائی کی طرف مائل، پیشانی بلند اور کشادہ، آنکھیں غزالی، ناک ستواں اور خوبصورت لب پُر گوشت اور متناسب، قدح سر گول، دھڑ اور جسم کے تناسب

کے مطابق ریش مبارک گھنی اور گھنگریالے بال۔ رنگ صبیح اور سُرخ، بدن دوہرا اور گُداز، قامت میانہ مائل بدرازی، سینہ پُرگوشت اور کشادہ، دست و پا مضبوط اور متناسب۔ رفتار شاہانہ طریق پر ذرا جھوم کر چلتے ہیں۔ اور قدم مضبوط اٹھتا ہے غرض پنجابی کے اس شعر پر بالکل پورے اترتے ہیں ؎

زُلف تری دے کُنڈل کُنڈل عاشق دا دل ڈولے
حُسن ترے دی صفت کی آکھاں کافر کلمہ بولے

یہ محض شاعرانہ تخیل ہی نہیں ہے۔ بلکہ تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت کے ساتھ عالم جوانی میں یہ واقعہ پیش آچکا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک ہندو لڑکی آپ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے ورثاء کو مجبور کیا کہ وہ اس کا عقد حضرت سلطان الحقیقت سے کر دیں۔ اور وہ اس کے لئے آمادہ بھی ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ لڑکی لاکھوں روپے کی جائیداد کی مالک ہونے کے علاوہ اسلام قبول کرنے کو بھی تیار تھی۔

ترجمہ: تیری زلف کے حلقہ حلقہ پر عاشق کا دل واری بلہاری جارہا ہے۔ تیرے حُسن کی کیا توصیف بیان کی جائے، اسے دیکھ کر کافر کلمہ پڑھ دیتا ہے۔

پنجابی زبان میں صفت کی "ف" کو ساکن بولنا یا شعراء کا اشعار میں باندھنا ناروا نہیں ہے۔

لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ شیروں کی کچھار میں عورتوں کا کیا کام۔ رہا اس کا اسلام لانا یہ غرض و غایت کے تحت ہے جو ہمیں پسند نہیں ہے ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند ست آشیانہ

عالمِ جذب

آپ جب چودہ سال کے سن کو پہنچے تو آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب آپ پر بہت زیادہ غلبۂ حال ہوتا تو آپ آبادی سے باہر نکل جاتے اور کئی کئی دن اسی عالم میں جنگلوں میں پھرتے رہتے۔ اگر کچھ میسّر† آجاتا تو کھا پی لیتے ورنہ یونہی وقت گزار دیتے۔ اس حالت میں آپ کے پاس صرف تین ضرورت کی چیزیں ہوتی تھیں۔ ایک تسبیح، دوسرا لوٹا اور تیسری چھڑی۔

اب آپ فرمایا کرتے ہیں کہ اس وقت ہمیں دو کام ہوتے تھے ایک اپنے آپ کو سزا دینا یعنی خودکوبی اور دوسرے گریہ وزاری۔ بہر طور ایک وحشت کا عالم ہوتا تھا۔ ویرانوں میں یونہی تو نہیں پھرا جاتا ؎

جہاں وحشت برستی ہے۔ جنوں کے ہیں وہی مسکن
سکوں آبادیاں بخشیں تو ویرانوں میں کیوں جائیں

† عموماً چولائی کے پتے آتشِ شکم کو بجھانے کے کام آیا کرتے تھے۔

لیکن اس دورِ وحشت اثر میں بھی عالم یہ تھا کہ اگر کوئی صاحب حاجت آجاتا اور اس کی جائز خواہش ہوتی تو فوراً اس کے لئے ارشاد ہو جاتا "جا تیرا کام ہو گیا اللہ کے فضل سے" اور جو ناجائز غرض و غایت لے کر آتا تو اُسے اپنے قریب تک نہ پھٹکنے دیتے۔ جب غلبۂ حال شدید ہوتا تو آپ بہت کم کلام فرماتے۔ لیکن جو منہ سے نکل جاتا پُورا ہو کر رہتا۔ اس عالم میں جب آپ کسی کو نظر بھر کر دیکھ لیتے تو اس پر خود جذب و مستی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اور ویرانوں کو اپنا مسکن بنا لیتا۔

کم و بیش بارہ سال آپ کی یہی کیفیت رہی۔ اس کے بعد آپ خود بخود کسی غیبی اشارہ کے تحت تقدّس مآب حضرت میاں خدا بخش رح کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

تقدّس مآب حضرت سلطان الحقیقت کے مرشدِ عالی مقام

تقدّس مآب حضرت میاں خدا بخشؒ قادریہ سلسلہ کے صاحبِ ارشاد بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ کی سکونت آباد پورہ، جالندھر میں تھی آپ چالیس سال حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح کے مزارِ اقدس پر حاضری دیتے رہے تھے۔ آپ حضرت احمدؒ شرف الدین رح، کلید بردار بغداد کے حلقۂ ارادت میں تھے۔ چالیس سال کے بعد آپ صاحبِ ارشاد ہو کر جالندھر تشریف لائے تھے۔ آپ چاروں سلسلوں۔ قادریہ نقشبندیہ۔ سہروردیہ اور چشتیہ کی طرف سے بیعت لینے کے مجاز

تھے۔ آپ ڈیڑھ سو سال تک حیات رہے۔ جب آپ کی عمر سو سال کو پہنچی تو آپ نے اناج وغیرہ بالکل کھانا چھوڑ دیا تھا۔ آپ صرف سحری کے وقت شربت یا لسّی کی قسم سے کوئی چیز نوش فرما لیا کرتے تھے۔ لیکن اس کا بھی کوئی خاص التزام نہ تھا۔ آپ کا وصال بروز یک شنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ مطابق ۹ جولائی ۱۹۵۰ء اوکاڑہ میں ہؤا۔ آپ کا مزارِ اقدس ساہیوال (سابق منٹگمری) قبرستان پیر بخاری میں مرجعِ خاص و عام ہے۔

اپنے ایک مکتوب میں تقدّس مآب حضرت سلطان الحقیقت راقم الحروف کو اپنے شیخ کی خدمت میں حاضری اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"عرض کی۔ حضور کی حضوری میں رہنے کی اجازت ہو۔ آپؒ نے فرمایا۔ بہت اچھا بیٹا۔ میاں فضل کریم رہو۔ پھر ارشاد ہؤا تمام کھانوں میں کس کھانے کو پسند کرتے ہو۔ جواب عرض کیا یہی مقام تو لینے کے لئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ جو کچھ میرے پیشوا پسند فرمائیں گے۔ وہی میرے لئے کھانا مناسب ہو گا۔ مزید استفسار ہؤا بیٹا لباس کس قسم کا پہنو گے۔ عرض کیا جو لباس حضور میرے لئے پسند فرمائیں گے۔ اور پہنائیں گے۔ میرے لئے ساری کائنات میں اس سے اچھا کوئی لباس نہ ہو گا

پھر ارشاد ہوا "بیٹا، اپنا نام بتاؤ۔ عرض کیا، حضور کی خدمت میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ میرا بھی کوئی نام رکھ دیا جائے تاکہ میں صاحبِ نام ہوں جاؤں۔ حضور جس نام سے مخاطب فرمائیں گے وہی میرا نام ہوگا۔
پھر استفسار ہوا رہنے کا کیا حال ہوگا۔ عرض کیا گیا۔ جہاں حضور رکھیں گے وہی میرا حال ہوگا"۔

اس کے بعد تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت کا یہ عالم تھا۔ کہ آپ اپنے مرشدِ عالی مقام کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے اور سر بزانو بیٹھے رہتے۔ آپ کو خاموش دیکھ کر لوگ تقدس مآب حضرت میاںؒ سے کہتے۔ "اس بچے کو کبھی بولتے نہیں دیکھا"۔ جواباً ارشاد ہوتا۔ "یہ بچہ اپنے وقت پر بولے گا۔ اور اس وقت کائنات میں اس کا کوئی جواب نہ ہوگا"۔

آپ چودہ سال اسی طرح اپنے مرشد کی خدمت میں رہے وہاں سے آپ کو چار انعام عطا ہوئے۔ ان میں سے پہلا قول کا، دوسرا اعمال کا، تیسرا علم کا اور چوتھا اخلاص کا۔

اس طویل حاضری کے بعد آپ اپنے مرشد کی اجازت سے اپنے رحمت خانہ پر تشریف لے آئے اور خلقِ خدا جوق در جوق آپ کی طرف رجوع کرنے لگی۔ گویا اس شعر کا لفظ بہ لفظ اطلاق

ہوتا تھا ؎

عشق سے بڑھتا رہے سوزِ جگر اچھا ہے
مرجعِ عام بنا اپنا بھی گھر اچھا ہے

آپ کے سامنے خلقِ خدا بہت سے ایسے مریض بچوں کو لاتی جو لا علاج امراض میں مبتلا ہوتے اور قریب المرگ ہوتے۔ آپ اس بچے کے سر پر دستِ شفقت پھرتے اور ساتھ ہی اس کا نام تبدیل کر دیتے۔ اس کے بعد اس کے ورثاء کو مخاطب کر کے فرماتے۔

تمہارا جو مریض بچہ تھا وہ بزرگانِ دین نے لے لیا ہے، اور اپنا تندرست بچہ اللہ کے فضل سے تمہیں عنائت کر دیا ہے۔ اور وہ بچہ اللہ کی مہربانی سے اسی وقت صحت یاب ہونے لگ جاتا۔ یہ سلسلۂ فیض اب بھی اسی طرح جاری ہے ؎

قدم قدم پہ اندھیرے ہیں زندگی کیلئے
جلا رہے ہیں دل و جاں کو روشنی کیلئے

متاہلانہ زندگی

آپ نے تقریباً چالیس سال کی عمر میں متاہلانہ زندگی اختیار کی۔ اولاد بھی ہوئی۔ اس میں چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی صاحبہ بقیدِ حیات ہیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے حضرت عبدالرزاق المعروف برضا حسین صاحب بلالی جمالی ہیں۔ آپ کو دو خاندانوں سے فیض عطا ہوا ہے۔ آپ حضرت مولوی محمود لیسین صاحب سے بیعت ہیں اور حضرت سلطان الحقیقت کے خلفِ اکبر ہیں۔ لہذا

ہر دو خاندانوں سے فیضیاب ہیں۔

دوسرے صاحبزادے حضرت مقبول الٰہی احمد تیسرے حضرت فدا الٰہی صاحب مست اور چوتھے حضرت علی محمدؒ صاحب ہیں۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ صفات سے نوازا ہے۔ حضرت سلطان الحقیقت کو اللہ تعالیٰ نے متاہلانہ زندگی میں ایک بہت بڑی آزمائش سے دوچار کر دیا تھا۔ لیکن بتوفیقِ ایزدی آپ نے توکل کو دنیاوی آسائش پر ترجیح دی اور ـــ ع

من از عالم ترا تنہا گزیدم

کہہ کر زہرِ غم نوش کر لیا اور تلخی کام و دہن کو چنداں محسوس نہیں ہونے دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکانِ ہستی کا ہوتا بھی یہی شعار ہے ؎

کھائی ہے ہم نے بھی تکمیل تمنّا کی قسم
موجِ خوں سر سے گذر جائے تو کیا ہوتا ہے

اس بارہ میں تقدّس مآب حضرت سلطان الحقیقت نے ایک درخواست کو شرفِ قبول بخشتے ہوئے ایک ذاتی بیان حضرت بابا خوشی محمدؒ صاحب المعروف رُوڈے شاہ صاحب کے رحمت خانہ پر جاری فرمایا ہے۔ وھو ہذا۔

"جب ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہوش عطا کیا (اور آہستہ آہستہ کیا) تو ہمارے والدین حضرت نبی بخشؒ اور محترمہ والدہ ماجدہ عمر بی بیؒ ہمیں شادی پر مجبور کرنے لگے۔ انکار اور مسلسل انکار کی صورت میں انہوں نے حضرت میاں خدا بخشؒ

سے اس سلسلہ میں مداخلت کی درخواست کی۔ تقدّس مآب حضرت میاں خدا بخشؒ نے ان کے التماس کو قبول کرتے ہوئے فرمایا۔

"بیٹا یہ سنت ہے۔ اگر اس سنّت کو قبول نہ کرو گے تو تمہارا عمل نبیوں سے بڑھ جائیگا۔ اور یہ زہدِ انبیاءؑ سے بڑھنے کی کوشش ہو جائے گی۔ اور یہ ترکِ ادب ہے لہذا بیٹا۔ اس مقام سے گذر جانا چاہیئے۔ ویسے اس مقام پر زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔ صرف سولہ سال لگیں گے۔ اور اس دوران میں سنّت کی تکمیل ہو جائے گی۔"

شیخ کی تعمیلِ حکم میں ہم نے والدین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور وہ کام کر لیا جس کی طرف طبیعت خوشی سے مائل نہ تھی۔ اس مقام پر حضرت خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں ؎

بمے سجّادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوئید
کہ سالک بے خبر بنود زراہ و رسم منزلہا

آخر رفیقۂ حیات نے ہمارے توکّل میں حائل ہونے کی کوشش کی (اور یہ بات اہلِ حق کو بھلی نہیں معلوم ہوا کرتی) ہم نے اس کے باوجود کہ عقد کو سولہ سال گذر چکے تھے اور اس دوران میں بچّے بھی کافی ہو چکے تھے بی بی صاحبہ سے کہہ دیا کہ آپ کا مقام بدل چکا ہے۔

درویش کے ساتھ رہ کر وہی کھانا پہننا† چاہیئے جو اسے مہیا ہو۔ کسی ایسی شئے کا مطالبہ جس کا اس کا توکل متحمل نہ ہو اس کی رفاقت سے دُور کر دیتا ہے۔ چنانچہ انہیں فارغ کر دیا گیا۔ اور انہیں حضرت خوشی محمدؒ عرف روڈے شاہ صاحب جو ہمارے جگری دوست اور عاشقوں کی جان ہیں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ اور انہیں سمجھا دیا گیا کہ یہ ہماری دین و دنیا کی امانت ہیں۔ ان کا ہر طرح کا تحفظ آپ پر فرض ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی شئے آپ کو کبھی بھی ہم سے درکار ہو تو بلا تامّل طلب فرمالیں۔ ہوتے ہوئے کسی شئے سے دریغ نہیں کیا جائیگا۔ چنانچہ آج تک یہی معمول ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی اس وعدہ سے سرتابی نہیں کی جائے گی۔ (یہ بیان مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کو بعد نماز فجر حضرت روڈے شاہ کے رحمت خانہ واقع ترنڈہ، رحیم یار خان ہوا)

ھجرت

برِّ صغیر کی تقسیم کے بعد آپ نے ماموں کانجن، تحصیل سمندری ضلع لائل پور میں مستقل سکونت اختیار فرمالی ہے۔ ویسے عقیدتمندوں نے مخلوقِ خدا کی بہتری اور فلاح کے لئے لاہور اور پاکستان کے دوسرے علاقوں میں عارضی مستقر بنا دیئے ہیں۔ تاہم آپ کا زیادہ تر قیام لاہور ہی

† اس کی وضاحت تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت نے اس طرح فرمائی ہے کہ محترمہ بی بی صاحبہ نے آپ سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کا لباس ان کی مرضی سے تیار کرایا جایا کرے۔ لباس کی سادگی انہیں ناپسند تھی۔

میں رہتا ہے۔ پاکستان کے تمام شہروں سے آپ کے عقیدتمند جوق درجوق یہیں آتے ہیں۔ اور فیض یاب ہوتے ہیں۔

مصائب و آلام میں گھری ہوئی جو مخلوق آپ آستانہ فیض پر آتی ہے۔ آپ اس کے حق میں دعائے خیر کر دیتے ہیں اور اس کی خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے سخت سے سخت مشکلات دُور ہو جاتی ہیں۔

اجتماعی معمولات

آپ رات کے دو بجے تہجد کے لئے بیدار ہوتے ہیں۔ اور آپ کے تمام محبیّن بھی اس معمول میں آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔ کم و بیش تیس چالیس اہلِ حق کا یہ اجتماع ہوتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے جدِّ انبیاءؑ حضرت ابراہیمؑ کو ایصالِ ثواب کے لئے دوگانہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تہجد پڑھی جاتی ہے۔ تہجد کے بعد تینتیس مرتبہ سورۂ مزمّل تلاوت کی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد شجرۂ شریف قادریہ فاضلیہ کو باعتبار مقامات پڑھا جاتا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر اسمائے غوث الاعظمؒ اور درودِ تاج کا وِرد کیا جاتا ہے۔ اسی اثناء میں صبح کی اذان ہو جاتی ہے۔ اذان کے بعد شرعی معمول کے تحت سنّتیں ادا کی جاتی ہیں۔ اور سنّتوں اور فرضوں کے درمیان چالیس بار سورۂ فاتحہ تلاوت کی جاتی ہے۔ اس کے بعد یا ودود کا وِرد ہوتا ہے اور پھر تین بار درود شریف پڑھ کر دعا مانگی جاتی ہے۔ اس میں والدین کی خیر و برکت یا مغفرت کے لئے دعا کرنا دعا کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بغیر دعا نامکمل سمجھی جاتی ہے

ان تمام معمولات سے فارغ ہو کر ایک قرآنِ کریم ختم کیا جاتا ہے۔ اور اشراق کے وقت نمازِ اشراق ادا کی جاتی ہے۔

اس کے بعد حضرت سلطان الحقیقت کی ہدایت ہے کہ اللہ کی زمین پر پھیل کر اس کا فضل تلاش کرو۔ کام مت تلاش کرو ورنہ مشقت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اگر فضل تلاش کرتے ہوئے کام مل جائے تو اسے بخوبی انجام دے دو۔ اسے اللہ تعالیٰ آسان فرما دیگا۔ اور جانکاہ مشقت سے بچ جاؤ گے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ روزی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملتی ہے خدا کی یاد سے غافل ہو کر محنت و مشقت سے نہیں ملتی۔ اسی لئے کہا گیا ہے ؎

اجگر کریں نہ چاکری پنچھی کریں نہ کام
داس ملوکا یوں کہیں سب کے داتا رام

یا پھر دوسرے مقام پر اس خیال کو یوں ادا کیا گیا ہے ؎

تلسی بروا باغ میں سینچت سے کمہلائے
رام بھروسے جو رہے پربت پہ لہرائے

اور قرآن حکیم میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (سورۃ جمعہ)

ترجمہ: جب نماز ادا کر چکو تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اس کا کثرت سے ذکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کو روزی کی تلاش پر مقدم رکھو یعنی حلال اور حرام میں تمیز کرنا سیکھ جاؤ۔

یہ تو روزانہ کے معمولات ہیں۔ ان کے علاوہ ہر جمعرات کو بعد نمازِ عشاء سوا لاکھ مرتبہ آیتِ کریمہ کا وِرد بھی کیا جاتا ہے۔

تقدّس مآب حضرت سلطان الحقیقت کے ذاتی معمولات

آپ بیدار ہو کر صرف یہی نہیں کہ روزانہ کے عام معمولات میں جماعت کے ساتھ شریک رہتے ہیں۔ بلکہ رات کے دو بجے سے دن کے دو بجے اور پھر تین، ساڑھے تین بجے سے رات کے گیارہ بجے تک لنگر کی تقسیم مریضوں کی دیکھ بھال اور عام حاجتمندوں کی حاجت روائی بھی آپ کے معمولات میں شامل ہے۔ ان فرائض کی انجام دہی میں جو محنت شاقہ آپ کو اس اسی پچاسی سال کی عمر میں انجام دینی پڑتی ہے۔ اس کی متحمل وہی شخصیت ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے پاک ہونے کے لئے اس کی مخلوق سے بے غرض وغائیت ہو جائے۔ یہ کسی اور کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ فیضانِ محبت ہے جو عام ہو رہا ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
عرفانِ محبت عام سہی فیضانِ محبت عام نہیں

اس پر مستزاد یہ کہ پرورشِ لوح و قلم کے لئے بیانات کے ذریعہ علوم و حقائق کے دریا بھی انہی مصروف اوقات میں بہائے جاتے ہیں۔ ایک لگن ہے جو دل کو لگی ہوئی ہے۔ اور ہر سانس کے ساتھ پہلے سے

زیادہ شدید ہوتی جاتی ہے ؎

اِک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھتی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

غرض یہ پیکرِ نور و ہدایت خدا کی محبّت اور عشقِ رسول کو اپنے پہلو میں لیئے ہوئے خدمتِ دین کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہر وقت زبانِ حال سے ساقی الست کو یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے ؎

ستارے گم دیئے خاموش لیکن تیرے رندوں کا
چراغِ ہر نفس روشن ہے لو مدّھم نہیں ساقی

اخلاقِ حسنہ

قول و فعل میں مطابقت

آپ کے اخلاقِ حسنہ میں ایک حقیقت پسند کو سب سے زیادہ جو چیز متاثر کرتی ہے وہ قول و عمل کا تطابق ہے۔ چنانچہ آپ تلقین بھی اسی کی فرماتے ہیں۔ آپ کا قول ہے۔ "اللہ کے پیارو وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں"۔ ایسے بیانات کے وقت حضور پر اکثر رقّت طاری ہو جاتی ہے اور آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ اب ذرا اس قول کا قرآنِ حکیم کی اس آیت سے تطابق دیکھیے۔ اور اندازہ فرمائیے کہ وہ شخص جو حرف شناسی کے اعتبار سے قطعاً اُمّی ہے۔ معنوی حیثیت سے قرآن حکیم پر اس کی کتنی گہری نظر ہے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (سورہ صف)

اے ایمان والو وہ کہتے کیوں ہو جو تم کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک اس سے بُری کوئی بات ہی نہیں ہے کہ کہا تو جائے کیا نہ جائے۔

اخلاص

آپ میں اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کسی سطح کا کوئی بھی آدمی کیوں نہ آجائے آپ کا پذیرائی کا طریقہ نہایت پیارا ہے۔ ایسے دور میں جب ؎

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

کی کیفیت ہو کسی بڑی شخصیّت کا اپنے پاس آنے والوں کو یہ کہکر پکارنا — "لوجی، لوجی — فلاں صاحب آگئے — نور والے نور والے — خیر و برکت آگئی، رحمت آگئی۔ عید ہوگئی۔ عید ہوگئی۔ آہاہا، عید ہوگئی — خود ہی قیاس فرمائیے دکھی انسان کے زخموں کے لئے کتنا بڑا اندمال کا سامان ہے۔

محبّت

جو لوگ تقدّس مآب حضرت سلطان الحقیقت سے ارادت و عقیدت رکھتے ہیں ان سے آپ بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مرید پوجتے ہیں اور پیر پجا کرتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کے

برعکس رسم ہے۔ مریدوں کی آپ جس طرح خدمت کرتے ہیں۔ اس سے حضور نبیِ کریم صلعم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ آج تک کسی ماں کو اپنے بچوں کی اس طرح خدمت کرتے نہیں دیکھا گیا جس طرح آپ اپنے مریدوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ کھانے پینے کے معاملہ میں تو خیر آپ اپنے پرائے میں کوئی امتیاز برتتے ہی نہیں ـــ البتّہ دیگر امور ـــ سونے، جاگنے اور بیماری کی حالت میں آپ کا جذبۂ خدمت دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ رات کو بستر عموماً اپنے ہاتھوں سے بچھاتے ہیں۔ صبح کو نہانے دھونے کا اہتمام خود کرتے ہیں۔ اور بیماری کی حالت میں رات رات بھر مریضوں کی دیکھ بھال میں گزار دیتے ہیں۔ ایک واقعہ سے آپ کے اس جذبۂ خدمت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب چنیوٹ کے شیوخ میں سے ہیں۔ آپ نے ان کے کسی مرض کے لئے ایک دوا تجویز کی۔ اس دوا کے استعمال کے لئے شرط یہ تھی کہ اسے رات کے دو بجے چائے کے ساتھ کھایا جائے۔ چند دن جب تک وہ ڈیرہ پاک میں مقیم رہے دوا کا اہتمام ہوتا رہا۔ اور حضور اپنے ہاتھ سے کھلاتے رہے۔ لیکن جب وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے اپنی والدہ اور بیوی کو اس معمول کو جاری رکھنے کے لئے کہا۔ انہوں نے ایک دن تو مر بھر کر یہ خدمت انجام دے دی۔ دوسرے دن دونوں ساس بہو پوچھنے لگیں ـــ ''کیوں جی، یہ دوا صبح ناشتہ کے ساتھ جو چائے ملتی ہے اس کے ہمراہ نہیں کھائی جا سکتی؟

شیخ صاحب نے فرمایا ـــ ''کھائی تو جا سکتی ہے، لیکن دوا تجویز کرنے والے بزرگ نے فرمایا ہے کہ اس دوا اور ناشتہ کے درمیان کم سے کم پانچ چھ گھنٹہ کا وقفہ ہونا ضروری ہے۔ اس دوا کو کھانے کے بعد حسبِ معمول صبح کے وقت رفعِ حاجت ہو اور اس کے آدھ گھنٹہ بعد کچھ کھایا پیا جائے۔ یہ سن کر ان دونوں نے یک زبان ہو کر کہہ دیا ـــ ''پھر آپ وہیں تشریف لے جائیں جہاں سے اس دوا کے کھانے کی ہدایت ملی ہے۔ ہم سے یہ روز روز کی شب بیداری نہیں ہوتی'' ـــ چنانچہ آپ پھر ڈیرہ پاک پر تشریف لے آئے ہیں۔ اور تادمِ تحریر اس دوا کو حسبِ ہدایت استعمال کر رہے ہیں۔

محویّت

رات دن کے چوبیس گھنٹہ میں آپ پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب آپ پر ''لی مع اللہ وقت'' کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو لوگ واقفِ حال ہیں وہ تو آپ کو اس وقت بلانے کی جراُت نہیں کرتے۔ لیکن جن لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے وہ اس وقت بھی آپ سے تخاطب جاری رکھتے ہیں۔ آپ دل آزاری کو بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں اس لئے اس محویّت کے عالم میں بھی ان سے محوِ تکلّم رہتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سلسلۂ کلام غیر مربوط ہو جاتا ہے۔ لیکن مجال ہے کہ پیشانی پر شکن آ جائے یا مخاطب سے کسی طرح کا تکدّر پیدا ہو جائے۔ بہر حال یہ کیفیت بالکل اس شعر کے مطابق ہوتی ہے ؎

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلّم کا

تبلیغِ حق

آپ اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ بزرگانِ دین کسی کو برائی کرتے ہوئے دیکھ کر زبان سے بہت کم روکا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برائی سے روکنے کیلئے تین ہستیاں مجاز ہیں۔ ان میں سے پہلی خدائے بزرگ و برتر، دوسری رسولِ اکرم اور تیسری بزرگانِ دین کی ہستی ہے۔ خدا اور رسُول تو پہلے ہی ہر برائی سے روک چکے ہیں۔ لہذا جو شخص اب بُرائی کر رہا ہے۔ وہ خدا اور اس کے رسول کی صریح نافرمانی کر رہا ہے۔ اگر اسے بزرگانِ دین روکیں اور وہ اپنی کم فہمی سے اس برائی پر اصرار کر کے ڈٹا رہے تو اس کا دنیا و دین میں کوئی مقام نہیں رہے گا۔ وہ اس لئے کہ وہ گناہ گار کے زمرے سے نکل کر کفر کی لعنت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس صورتِ حال سے صرف اسی کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ مبلّغ بھی خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ جو آدابِ تبلیغ کو ملحوظ نہ رکھ کر اس جسارت کا ارتکاب کرائے گا۔

لہذا بزرگانِ دین کا طریقۂ کار یہ ہے کہ جس شخص سے کوئی بُرائی چھڑانی چاہتے ہیں تو اُسے برملا نہیں ٹوکتے بلکہ اسے اپنے ساتھ اس قدر مانوس کر لیتے ہیں کہ وہ ہر بات ماننے لگتا ہے پھر بتدریج اسے ایسے مقام پر لے آتے ہیں کہ وہ وہاں پہنچ کر خود بخود برائی کو برائی سمجھنے لگتا ہے۔ اور اسے ترک کر دیتا ہے۔ یا پھر ایک معمولی اشارہ اس کے لئے کافی ہو جاتا

ہے۔ طعن و تشنیع بزرگانِ دین کا شعار نہیں ہے اس سے حدّت پیدا ہوتی ہے۔ اور حدّت سے ضد بڑھتی ہے۔ جس کا نتیجہ لازمی طور پر انکار نکلتا ہے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے ؎

نکالا چاہتا ہے کام طعنوں سے بھلا غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

یہی وجہ ہے کہ بزرگانِ دین افہام و تفہیم کے وقت ٹھنڈا ماحول پیدا کر لیتے ہیں۔ اور کلام کرتے وقت مخاطب کے فہم اور اس کی فراست کو پیشِ نظر رکھّا کرتے ہیں۔

اب ذرا اس نظریہ کی عملی صورت بھی ملاحظہ فرمالیں۔ اس سلسلہ کے چند واقعات پیش ہیں۔

(۱) آپ کا قاعدہ ہے کہ آپ کا جہاں قیام ہوتا ہے نماز کے وقت وہیں باجماعت نماز ادا فرمالیا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بہاول پور میں جہاں آپ کا قیام تھا اس قیامگاہ کے عین سامنے مسجد تھی۔ حضور نے حسبِ معمول قیام گاہ ہی پر نماز ادا فرمالی۔ اور پھر طرفہ یہ کہ اُس مسجد کا بانی خود حضور کے مقتدیوں میں شامل تھا۔ اس مسجد کے امام صاحب جو ایک بہت بڑے عالم ہیں یہ برداشت نہ کرسکے۔ وہ خود حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عالمانہ لب و لہجہ اختیار کر کے فرمانے لگے کہ بزرگانِ دین تو مساجد اللہ کو آباد کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔ انہیں اُجاڑنے کے لئے نہیں۔ اگر آپ پنج وقتہ نماز مسجد میں ادا فرمالیا کریں تو ہر نماز میں سینکڑوں نمازیوں

کا اضافہ ہو جایا کرے۔

آپ نے انہیں اطمینان سے بٹھا کر تواضع وغیرہ کی اور اس کے بعد نہایت شفقت بھرے لہجہ میں گویا ہوئے ”حضرت! شریعت کی رُو سے فرد کو جماعت کے تلاش کرنے کا حکم ہے۔ جماعت کو جماعت کے تلاش کرنے کا حکم نہیں۔ جماعت جہاں موجود ہو وہیں قیام کر سکتی ہے۔ لیکن یہ فقہی جواب ہے جس سے صرف شریعت ہی کا گھر پورا ہوتا ہے۔ اہلِ حق حقیقت سے اپنے عمل کیلئے فتویٰ لیا کرتے ہیں۔ لہذا اس عمل کی حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس بہت سے ایسے طفلان گریز پا، آتے ہیں، جو کوٹ پتلون کا عذر رکھتے ہیں۔ اگر نماز کے وقت مسجد میں جانے کا اہتمام کیا جائے تو صرف وہی لوگ وہاں پہنچیں گے جو یہ عذر نہیں رکھتے ہوں گے یا پھر دیرینہ ذوق عبادت رکھتے ہوں گے۔ باقی سب سُوٹ پوش جو سو میں سے نوّے ہو سکتے ہیں اِدھر اُدھر کھسک جائیں گے۔ یہاں وہ طوعاً و کرہاً جماعت میں تو شریک ہو جاتے ہیں اور فرض ادا کر لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ جب وہ چند نمازیں اسی طرح ادا کر لیں گے تو ان کے لئے یہ عمل سہل ہو جائے گا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا، جب وہ مساجد تک خود بخود پہنچنے لگیں گے۔ اس وقت وہ آپ کا مال ہوں گے پھر جیسے چاہیں انہیں سنبھال لیں“

(۲) بہاول پور کے ایک نومسلم شیخ صاحب ہیں جو خطاط بھی ہیں انہیں ایک مسودہ کی کتابت کے لئے حضور نے طلب فرمایا۔ انہوں نے

اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور فوراً حاضر ہو گئے۔ ان کے دل میں یہ بات تھی کہ یہ فقیر لوگ جو جنگلوں میں رہ چکے ہوتے ہیں ان کے پاس کوئی نسخۂ کیمیا ضرور ہوتا ہے۔ لہذا ان کی یہ خدمت خاطر خواہ طریق پر انجام دے کر اور کچھ چکنی چپڑی باتوں میں لا کر وہ نسخہ حاصل کر لیا جائے۔ چنانچہ تقدس مآب نے وہ مسوّدہ انہیں کتابت کی غرض سے دے دیا۔ لیکن اسی اثناء میں ان کے منہ سے یہ نکل گیا کہ ان کا دھیان عبادت کی طرف بالکل نہیں بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو ان کا جی یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی نیت تڑوا دیں۔ تقدس مآب نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن تھوڑے توقف کے بعد انہیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر ان سے وہ مسوّدہ واپس لے لیا اور کہہ دیا ”ابھی یہ مسوّدہ ترمیم طلب ہے جب درست کر لیا جائے گا۔ اس کی کتابت آپ ہی کو سونپی جائے گی۔“ اس کے بعد چند اور باتیں کر کے انہیں یہ شعر سنا دیا ؎

بھلا ہوا ہم نیچ بھئے سب کو کریں سلام
جنم جو لیتے اونچ کے کبھی نہ ملتا رام

معلوم نہیں اس ایک شعر نے اس نومسلم کو ماضی کے کون سے دریچے جھنکا دیئے کہ اس پر ایک دم رقت طاری ہو گئی۔ وہ دن سو آج کا دن اس کا رونا ہی نہیں تھمتا۔ اب وہ پانچ نہیں بلکہ سات وقت کا نمازی ہے اور ہر وقت باوضو رہتا ہے۔ اسے شاعری وغیرہ سے دُور کا بھی لگاؤ نہ تھا اب وہ تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت کی

منقبت میں ایسے ایسے اشعار کہتا ہے۔ کہ سننے والوں پر ایک دم رقّت طاری ہو جاتی ہے۔ خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رُلاتا ہے۔

(۳) چنیوٹ کے ایک مولوی صاحب نے تقدّس مآب کو پیغام بھجوایا کہ انہوں نے تبلیغ کے دوران کچھ ایسی باتیں کہی ہیں کہ ان سے وہاں کے اہلِ تشیّع بھڑک اٹھے ہیں اور ان کے قتل کے درپے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی سلامتی کے لئے دُعا فرمائی جائے۔

حضرت تقدّس مآب نے پیغامبر کو کہا کہ جواب میں ہمارا انہیں یہ پیغام پہنچا دو کہ اگر آپ نے یہ تبلیغ کسی دنیاوی غرض و غایت کے تحت کی تھی تو آپ کا حشر وہی ہونا مناسب ہے۔ جس کا آپ کو ڈر ہے اور اگر اس تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کی نیت نیک تھی اور پیغام حق پہنچانا مقصود تھا تو ہمیں بتایا جائے کہ اس میں خوف کا کون سا مقام ہے۔ یہ تو ایک مبلّغ کی معراج ہے کہ اسے پیغامِ حق پہنچاتے ہوئے شہادت نصیب ہو جائے

(۴) راقم الحروف نے تقدّس مآب حضرت سلطان الحقیقت کا ایک بیان قلمبند کرتے وقت "کسی کی بات نہ ماننا" اپنی منوائے جانا نفس امّارہ کے بجائے کسی کی بات نہ ماننا اپنی منوائے جانا نفس امّارہ کے محرکات میں سے ہے۔ "اس کا حامل دین و دنیا دونوں سے غافل ہوتا ہے اور دونوں جہانوں سے راندہ جاتا ہے" کر دیا یعنی ایک فقرہ "دونوں جہانوں سے راندہ جاتا ہے" کا اضافہ کر دیا۔ آپ نے جب پورا بیان پڑھوا کر سنا تو فرمانے لگے، عزیز اس فقرہ کو کاٹ دو۔ کسی کو راندہ یا رکھنا یہ ذاتِ حق کا اپنا کام ہے۔ ہم اسکی مخلوق کے حق میں کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں اور پھر ہم

تو اللہ کے بندوں کو اس کی رحمتوں سے ہمکنار کرانے آئے ہیں۔ مایوس کرنے نہیں۔ "رحمتِ حق بہانہ می جوئید۔ بہانمی جوئید"۔

(۵) ایک شخص نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ حضور میرے بچے کو نصیحت فرمائیے کہ وہ سنّت کا احترام کرے اور ڈاڑھی رکھ لے آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ وہ بالغ ہے اور اپنے نفع نقصان کو خوب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ یہ فیصلہ اسی کو کرنا ہوگا۔ ہم اگر کوئی فیصلہ اس پر ٹھونپ دیں گے تو وہ الجھ جائے گا۔ بزرگانِ دین لوگوں کو سلجھانے آتے ہیں مزید الجھانے نہیں۔

(۶) بزرگانِ دین کبھی تبلیغِ حق کرتے وقت نظر کے تصرّف سے بھی کام لے لیتے ہیں، چنانچہ حضرت اقدّس مآب سے کراچی میں ایک دسویں جماعت کے بچے نے (جو غلط ماحول کے سبب اشتراکیت سے متاثر تھا) سوال کیا کہ ہمارے پیدا ہونے کا کیا مقصد ہے۔ آپ نے اس سے نظر ملا کر جواب دیا "بس یہی کہ ہم تم سے مل لیے اور تم ہم سے مل لیے" اسی وقت سے وہ لڑکا آپکا ایسا گرویدہ ہو گیا کہ اسے آپ کو دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا۔ اس دن سے اس نے اپنے معمولاتِ زندگی ہی بدل دیئے۔ جس بات کے لئے اس کے بزرگ ایک عرصہ سے کوشاں تھے۔ اور اس میں پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ چند ثانیہ میں اس کے اندر پیدا کر دی۔ اب وہ اپنی کلاس کے بچّوں کو حضور کے پاس لانے کے لئے کچھ اس طرح سمجھاتا ہے —— "آؤ تمہیں ایک حقیقت آشنا سے روشناس کراؤں۔ یہ بزرگ اس دور کے بہت بڑے ہادی ہیں"

اسے کہا جاتا ہے ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خوفِ خدا

انسانوں کے ساتھ جو آپ کو شفقت ہے اس کی مثال تو بزرگانِ دین کے سوا شائد ہی کہیں ملے۔ البتہ عام خلقِ خدا کے ساتھ جو آپ کا جذبۂ ترحم ہے اس کی نظیر مشکل ہی کہیں ملے گی۔ اُسے خوفِ خدا ہی کہہ سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایک دن ایک بچھو نکل آیا۔ آپ نے اُسے مارنے کے لئے ایک ساتھی کو کہا۔ اس نے ارشاد کی تعمیل میں جیسے ہی اُسے مارنے کے لئے جُوتی اٹھائی آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ تعجب سے حضرت تقدس مآب کی طرف دیکھنے لگا۔ آپ نے کچھ تامل فرما کر پھر ارشاد فرمایا۔ اچھا اب مار دو۔ اس نے پھر جب حکم کی تعمیل کرنی چاہی آپ نے پھر ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا اسے کسی ایسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں یہ کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔ ویسے اسے اب جہاں بھی چھوڑ دوگے یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچائیگا۔ لیکن احتیاط پھر بھی ضروری ہے۔

توکّل

بزرگانِ دین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ متوکّل رہتے ہیں۔ نیک و بد میں امتیاز ان کا خاصّہ ہے۔ کسی ترغیب یا تحریص

کے ذریعہ انہیں جادۂ ہدایت سے نہیں ہٹایا جا سکتا اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے ان کی نظر آسمان کی طرف رہتی ہے۔ زمینی اسباب پر وہ بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ شیطان کے دجل و فریب کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے جب ابلیس مصلحت بینی، ریاکارانہ معصومیت اور ناصح مشفق کا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے تو فوراً زیرِ لب تبسّم کے ساتھ فرما دیتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

اب اس سلسلہ کے چند واقعات تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت کے بھی ملاحظہ ہوں۔

(۱) جب آپ ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لائے تو بعض بااختیار حکام نے پیشکش کی کہ حضور جس قدر زمین آپ پسند فرمائیں ہم آپ کو الاٹ کئے دیتے ہیں۔ اگر آپ خود پسند نہ فرمائیں تو جسے ارشاد ہو اسے دیئے دیتے ہیں۔ تقدس مآب نے اس پیشکش کے جواب میں یہی ارشاد فرمایا کہ آپ زیادہ سے زیادہ ہمیں سو دو سو مربعے زمین عطا فرما دیں گے یا پھر ہمیں چند کوٹھیوں اور بنگلوں کا اضافہ کر دیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی جتنی زمین ہے وہ سب ہماری ہے۔ اس میں سے ایک انچ بھی کم نہیں ہے۔ پھر آپ ہی بتائیں کہ ہم اتنی حقیر پیشکش کو قبول کر کے کیسے اپنا منہ کالا کرا سکتے ہیں۔ آپ جو کچھ ہمیں دینا چاہتے ہیں مستحقین میں بانٹ دیں۔

(۲) تقدّس مآب کے زیرِ علاج ایک خاتون تھیں اور ان حالت کی نازک تھی۔ فرمانے لگیں حضور میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے بیت اللہ شریف کی زیارت سے مشرّف ہوؤں۔ میرے پاس سات لاکھ روپیہ موجود ہے اُسے آپ امانت رکھ لیں۔ اگر مَیں زندہ واپس آجاؤنگی تو لے لوں گی بصورت دیگر آپ کو اختیار ہوگا کہ اسے جیسے پسند فرمائیں صَرف کر لیں۔ تقدّس مآب نے جواباً ارشاد فرمایا۔ ہم اس صورتِ حال کی موجودگی میں کسی کی امانت رکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اس میں سے بقدر ضرورت اپنے پاس رکھ کر باقی رقم اہلِ احتیاج میں تقسیم کردیں۔ اس سے آپ کی دنیا و عاقبت سنور جائے گی۔

(۳) ایک صاحب حضور کے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے حضور میرا ایک ناخلف لڑکا ہے۔ مَیں اس سے سخت بیزار ہوں اور اسے عاق کردینا چاہتا ہوں۔ میری دو ڈھائی لاکھ کی جائیداد ہے۔ میری خواہش ہے کہ مَیں اسے آپ کی زیرِ تعمیر مسجد کے لئے آپ کی نذر کردوں۔ حضرت تقدّس مآب نے فرمایا نہیں بھائی ہماری مسجد کو آپ کی جائیداد نہیں چاہئے۔ یہ حق آپ کے لڑکے کا ہے خواہ وہ کتنا ہی ناخلف کیوں نہ ہو۔ جب اس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو آپ نے بیزار ہو کر فرمایا نہیں بھائی ہم آپ سے یہ سودا نہیں کرنا چاہتے۔ آپ یہ معاملہ کسی اور مسجد کے منتظمان سے کرلیں۔ ہم ایک نیکی کے لئے دوسری برائی مول نہیں لینا چاہتے۔

حق گوئی

آپ کی عادت ہے کہ عام دنیاوی امور اور ذاتی معاملات میں کسی کی دل آزاری پسند نہیں فرماتے۔ جو کسی کی خواہش ہوتی ہے اسے حتی المقدور پوری فرما دیتے ہیں۔ لیکن دینی امور میں ناجائز رعائت اپنے منصب کے خلاف تصوّر فرماتے ہیں۔

آپ کی خدمت میں ایک متصوّف حاضر ہوا۔ اور آپ سے تصوّرِ شیخ کے بارے میں مستفتی ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا جو لوگ بزرگانِ دین کے خیالی تصوّر باندھتے ہیں۔ ان کا عمل ناقص ہوتا ہے۔ بزرگانِ دین کے وجود کو اللہ تعالیٰ عمل کی صورت میں اتارتا ہے۔ لہذا بزرگانِ دین کے دل کو اللہ تعالیٰ کا علم جاننا چاہیے، اور بس۔ تصوّر کوئی عملی صورت نہیں ہے۔ اور نہ اُسے علم کا مقام حاصل ہے۔ جس فعل کو شریعت، طریقت اور حقیقت کی رُو سے علم و عمل کا درجہ حاصل نہ ہو وہ کارِ عبث ہوتا ہے۔ اور سالک کے لئے کسی کارِ عبث کا کرنا قطعاً منع ہے۔ اس جواب سے وہ مستفتی سخت پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اور دوسرے دن مسجد کے امام پر غلط قرآنِ حکیم پڑھنے کا الزام لگا کر اس سے اُلجھ پڑا اور رخصت ہو گیا۔

صبر و تحمّل

آپ کا ارشاد ہے کہ انسانیت کی معراج مخالف کے ساتھ موافقت کرنے سے شروع ہوتی ہے۔

اس قول کی عملی صورت اس دن دیکھنے میں آئی جب ایک فاترالعقل

ڈیرے پاک آیا اور پوری دریدہ دہنی سے حضرت تقدّس مآب کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔ نقلِ کفر کفر نباشد۔ وہ حضور کو مخاطب کر کے زور زور سے چیخ کر کہہ رہا تھا ــــ "مَیں امام مہدی آگیا ہوں۔ یہ تو نے کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے، اٹھا اپنا بھنڈارا۔ اٹھا یہاں سے چارپائیاں۔ یہ سب کیا ہے"۔ اور بہت ساری مغلظات بک کر "مَیں تیرا پیٹ چاک کر دونگا۔ مَیں تجھے خاک میں ملادوں گا۔ وغیرہ" بکواس کرتا رہا۔ ڈیرہ پاک پر ایک ڈاکٹر صاحب مقیم تھے انہوں نے اس کا گریبان پکڑ کر اُسے سزا دینی چاہی۔ لیکن تقدّس مآب نے یہ کہہ کر انہیں ایسا کرنے سے روک دیا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں آپ کچھ نہ کہیں۔ پھر اس مخبوط الحواس کے قریب ہو کر اور اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا آپ تشریف رکھیں۔ پہلے آپ کچھ کھا پی لیں پھر اطمینان سے باتیں ہونگی۔ لیکن وہ ایسی تواضع کو کب خاطر میں لانے والا تھا۔ کہنے لگا۔ بس بس رہنے دے ان باتوں کو مجھے اگر بیٹھنا ہو گا تو خود بیٹھ جاؤں گا۔ تیرے کہنے سے ہرگز نہیں بیٹھوں گا۔ حضرت تقدّس مآب نے اس کی اس بات کا بھی بُرا نہیں منایا اور ارشاد فرمایا۔ اچھا اگر آپ کو بیٹھنا پسند نہیں ہے تو نہ بیٹھیں۔ آپ کی جب مرضی ہوا کرے یہاں تشریف لے آیا کریں۔ ہو سکتا ہے کبھی آپ کی باتوں سے ہماری اصلاح ہو جائے۔ اس شخص نے یہ سنا اور بُرا سا منہ بنا کر رخصت ہو گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد تقدّس مآب کے نیاز مندوں نے خدمتِ عالی میں حاضر ہو کر عرض کی کہ حضور یہ بات مناسب نہیں ہے کہ لوگ آپ سے اس طرح بالمشافہ مخاطب ہوا کریں۔ اس کی ہمیں اجازت

ہونی چاہیئے کہ ایسے دریدہ دہنوں کو قرارِ واقعی سزا دیا کریں۔ حضور تقدّس مآب نے زیرِ لب تبسّم کے ساتھ فرمایا کہ جب بھیجنے والا موافقین کو بھیجتا ہے اور وہ ایک کثیر تعداد میں آکر مدح و ستائش کرتے ہیں تو آپ لوگ انہیں انعام و اکرام دینے کا کیوں اہتمام نہیں کرتے۔ اب اگر اس نے ایک مخالف کو بھیجدیا ہے تو آپ اس قدر برافروختہ ہو گئے ہیں کہ اس کے پُرزے اُڑانے کے درپے ہیں۔ عزیزو! ہر ایک کو حقیقت پسند بننا چاہیئے اور خدا کو کسی حال میں فراموش نہیں کرنا چاہیئے ورنہ لوگ اس طرح زبانِ طعن دراز کریں گے ؎

ظفرؔ اس کو آدمی نہ جانئے گا خواہ ہو فہم و ذکا میں وہ کتنا بڑا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

علمی مقام

حضرت سلطان الحقیقت کا باوصف اُمّی ہونے کے علمی مقام نہایت بلند ہے۔ آپ فرمایا کرتے ہیں یہ کتابی علم تو کسب سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر ہم اسی پر انحصار کر لیتے تو یہ ہمارے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اس سے تو ہم دعائیں مانگ کر بچے ہیں۔ اگر ہم اسے حاصل کر لیتے تو علمِ حقیقی سے وہ حصّہ نہ ملتا جو بزرگانِ دین کو "ام الکتاب" سے خصوصی طور پر عطا ہوا کرتا ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے مکتبِ عشق میں درس لینا پڑتا ہے۔ اور ساقیِ ازل کے میکدے میں ایک عمر تک بادہ نوشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی لئے ایک مفتی (صدرالدّین) نے یہ فتویٰ صادر کر دیا ہے ؎

کامل اس طبقۂ زہّاد سے نہ اٹھا کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

ایک دوسرا شاعر بغیر بصیرت کے علم و دانش کو اس طرح تعبیر کرتا ہے ؎

بے بصیرت علم و دانش کا کوئی حاصل نہیں
اس اُجالے میں بھی اکثر ٹھوکریں کھاتے ہیں لوگ

اس ضمن میں یہ بتا دینا نہایت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت تقدس مآب کو شعر فہمی کا ملکہ بھی بہت بڑا عطا فرمایا ہے۔ آپ نہ صرف اپنے کلام کے دوران ہی اردو، فارسی اور پنجابی کے اشعار پوری بے ساختگی کے ساتھ پڑھ دیتے ہیں بلکہ جب کوئی کسی کا کلام سنا رہا ہو تو آپ موقع محل کے مطابق اس میں ایسا تصرف فرما دیتے ہیں کہ اس پر حقیقت کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور پوری محفل پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

راقم الحروف نے حضرت تقدس مآب کی خدمت میں ایک نعت پیش کی۔ آپ نے ہر شعر پر جی کھول کر داد دی لیکن جب اس شعر ؎

جینا سکھا یا عزم سے مرنا سکھا دیا
تیرا جمال ہمتِ مرداں کی آبرو

پر پہنچے تو آپ ایک دم ٹھٹک گئے۔ فرمانے لگے اہلِ حق کبھی نہیں مرا کرتے وہ آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ "جینا" یا "مرنا" جیسے الفاظ حقیقت سے عاری نعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس شعر کو اس طرح ہونا

چاہیے ؎

آنا سکھایا عزم سے جانا سکھا دیا
تیرا جمال ہمتِ مرداں کی آبرو

یہ تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت کی زندگی کے چند اجمالی واقعات ہیں† جو پیش کر دیئے گئے ہیں۔ بہر حال یہ وہ ہستیاں ہیں جو زبانِ حال سے گلشنِ ہستی کے ہر پھول کو پکار پکار کہہ رہی ہیں ؎

اے گلو کر لو زیارت ٹوٹ کر دیوانہ وار
ہم چمن میں بار بار آتے نہیں مثلِ بہار

ماموں کانجن، تحصیل سمندری، ضلع لائلپور
مورخہ ۱۱ر نومبر ۱۹۷۶ء

ابو مسلم صحافی

† اعلیٰ حضرت تقدس مآب سلطان الحقیقت کی زندگی کے واقعات میں تصرفات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس تالیف کے دامن میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ ان کا کچھ حصّہ بھی اس کا جزو بنایا جا سکے۔ لہٰذا اس کے لئے علیحدہ ایک تالیف کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ العزیز یہ کام بھی بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ (صحافی)

حرفِ گفتنی

خضر اگر نیست قدم میزن و میکوش کہ من
رفتم آخر بحرم از رہِ خزلاں رفتم
(عرفی)

جب انسان کے شعور کی آنکھ کھلتی ہے اور زندگی کی طویل اور تھکا دینے والی راہ کو اپنے سامنے پاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا منزل کی جانب جو قدم بھی اُٹھے نہایت استوار اور مضبوط ہو۔ کسی مقام پر لغزش کا تصوّر ہی اس کے دل کو دہلا دیتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے ؎

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

لیکن ان تمام احتیاطوں کے باوصف گمرہی کا یہ عالم ہے کہ وہ منزل گہہِ دوست جسے حق کی منزل کہا جاتا ہے ہر ایک کی نظر سے اوجھل ہے۔ یعنی ــــ ع کس ندانست کہ منزل گہہِ مقصود کجاست

اور پھر طرفہ یہ ہے کہ جو شخص جس راہ پر چل رہا ہے اسی کو درست سمجھ رہا ہے اور سب کو اسی پر دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر شخص کے لئے اس کے ہم مسلک کے سوا دوسرا ہر شخص گم کردہ راہ ہے۔ اصطلاحی طور پر اسی کو عصبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ کچھ مذاہب کے ماننے والوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اقوام جو سرے سے کسی مذہب کو مانتی ہی نہیں ہیں۔ ان کا بھی یہی عالم ہے۔ سچ پوچھا جائے تو ان کا یہی مذہب ہے کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر کوئی مسلک نہ ہونا بھی تو ایک مسلک ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بھی اپنے نظریات کا اسی شدّ و مدّ سے پرچار کرتی ہیں جس سے مذاہب کو ماننے والے کیا کرتے ہیں۔

جب نظریات کی دنیا میں اس حد تک بوقلمونی پھیلی ہوئی ہو تو خود اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسے نووارد جادۂ حیات کیلئے جس کے رُخ کا بھی صحیح طور پر تعین نہ ہوا ہو کس قدر سخت مقام ہوتا ہے۔ اسے ہر ہر قدم پر ٹھوکر کھا جانے کا احتمال رہتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے ؎

راہروِ راہ محبّت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

لیکن اگر اندازِ کار بدل دیا جائے اور بحث و تمحیص کے بجائے ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ جگہ لے لے تو یہ بات مسلسل مشاہدہ نے پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ اس سے حقیقت کی وہ شمعیں

روشن ہو جاتی ہیں کہ جو راہرو راہِ حیات کو منزلِ مقصود تک نور بخشتی رہتی ہیں۔ اور اس کے علی الرغم تجربات کی صداقتوں کو چھوڑ کر محض زبانی قیل و قال ہی تک نوبت رہے تو اختلافات کی تند و تیز آندھیاں بغض و عداوت کے جھونکوں سے انہیں شعلہ بسر نہیں رہنے دیتیں۔ اور گذرگاہوں پر دبیز تاریکی چھاتی چلی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں راہِ حقیقت کا راہی پکارتا رہ جاتا ہے — ع دُور منزل ہے اور اندھیرا ہے

لہٰذا راقم الحروف نے جگ بیتی کو موضوعِ بحث بنانے کے بجائے آپ بیتی کو اس کتاب کے قاری کے سامنے پیش کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اور اسے کسی مشورہ کا پابند نہیں کیا گیا ؎

من نگویم کہ ایں کن و آں کن
مصلحت بیں و کارِ آساں کن

آئندہ سطور میں آپ وہ واقعہ ملاحظہ فرمائیں گے جو اس احقر کو راہِ حق کی تلاش میں پیش آیا اور اس نے اسے صحیح سمت کی جانب گامزن کر دیا۔

محبتے ورزیدہ ام

ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم
کارے دگرست و عشق کارے دگرست

کراچی میں میرے ایک بزرگ دوست ہیں، جناب احمد دستگیر صاحب انہیں ایک عرصہ سے اصرار تھا کہ میں ان کے شیخِ طریقت کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کروں۔ لیکن سوءِ اتفاق سے موصوف نے مجھے پہلی ہی نشست میں یہ کہہ کر بدکا دیا کہ ان کے روحانی پیشوا قطعی آشنائے مکتب نہیں رہے ہیں۔ یہ سُن کر میں ان کی بات ماننے سے اس لئے اعراض کرنے لگا کہ میرے ذہن میں ایک بہت بڑے اہلِ حق کا یہ قول تھا کہ "ولی نا آشنائے علم نہیں ہوتا" اور نا آشنائے علم کی تعریف بھی میرے ذہن میں وہی تھی جو اہلِ مکتب کیا کرتے ہیں۔

بس یہی ایک بات تھی کہ میں چھ سات ماہ تک ان سے متفق نہ ہو سکا۔ جب بھی ہم کہیں راستے میں مل جاتے ہمارا موضوعِ بحث یہی بن جاتا اور کسی نہ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر گھنٹوں تبادلۂ خیالات کرتے رہتے

اور نتیجہ وہی ہوتا "ڈھاک کے تین پات" ۔ یعنی ؎

پئے مشورت مجلس آراستند
نشستند و گفتند و برخاستند

سے بات آگے نہ بڑھتی ۔

آخر ایک دن زچ ہو کر میں نے عرض کیا کہ میرے محترم دوست روز روز کی تضیعِ اوقات سے کیا فائدہ ۔ مَیں آپ کے علم و فضل کا معترف ہوں اور ساتھ ہی مجھے آپ کے خلوص اور دیانت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ اگر آپ کسی سے مجھے بیعت کرانا ہی ضروری تصوّر فرماتے ہیں تو لائیے اپنا ہاتھ میں آپ کی اس خواہش کی تکمیل کئے دیتا ہوں ۔ یہ سن کر وہ نہایت سنجیدہ ہو گئے ۔ اور بڑی متانت سے فرمانے لگے ۔ کیا واقعی آپ مجھ پر اسی قدر اعتماد کرتے ہیں ۔ مَیں نے اس کا جواب اثبات میں دیا ۔ یہ سن کر ان پر ایک گونہ رقت طاری ہو گئی ۔ اور فرمانے لگے تو پھر قیاس فرمائیے کہ وہ کیسا ہو گا جس پر مجھے اعتماد ہے ۔ یہ دلیل اس قدر قاطع تھی کہ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا ۔ چنانچہ مَیں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ جب آپ کے حضرت صاحب کراچی تشریف لائیں تو مجھے اطلاع دینے کی زحمت گوارا فرمالیں ۔ مَیں ضرور ان کی زیارت سے مشرّف ہونگا ۔

بات آئی گئی ہو گئی ۔ کئی ہفتہ تک میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی ۔ ایک دن بڑی عجلت میں وہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے ۔ مجھے دیکھتے ہی آواز دے کر بلایا اور فرمانے لگے ۔ حضور کل تشریف لا رہے ہیں ۔

آپ کا قیام "ٹمر نکولاس" کے دفتر واقع نئی چالی میں ہو گا ۔ آپ ٹھیک بارہ بجے وہیں تشریف لے آئیں ۔ اتنا فرما کر وہ تو بس میں سوار ہو گئے ۔ لیکن مَیں ان کے خلوص پر غور کرتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا ۔

اگلے روز مَیں بتائے ہوئے پتہ پر پہنچا ۔ اور دانستہ ایسے مقام پر بیٹھا جہاں میرے جوتے قریب ہی تھے ۔ نیت یہ تھی کہ جب جانے کا ارادہ ہو تو اس میں کوئی دِقت حائل نہ ہو ۔ چنانچہ ہوا بھی یہی ۔ محترم دستگیر صاحب نے نہایت اچھی طرح پذیرائی کی چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد مَیں نے ان سے رخصت چاہی ۔ انہوں نے نہایت فراخ پیشانی سے اجازت دے دی ۔ لیکن اگلے دن پھر آنے کے لئے کہہ دیا ۔ دوسرے دن بھی وہی "نشستند و گفتند و برخاستند" کی کیفیت رہی ۔ لیکن تیسرے دن آنے کی پھر ہدایت ملگئی ۔

تیسرے دن مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ روز روز کا آنا جانا کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے ۔ طریقہ ایسا ہونا چاہئے کہ دوست بھی ناراض نہ ہو اور چھٹکارا بھی ملجائے اس لئے یہی موزوں ہو گا کہ ان کے پیر و مرشد ناخواندہ تو ہیں ہی ان کے سامنے کوئی علمی سوال پیش کر دو ۔ یقیناً وہ جواب سے قاصر رہ جائیں گے ۔ اور اپنی نجات ہو جائے گی ۔ یہ خیال کر کے مَیں نے اپنے محترم دوست سے کہا کہ وہ اپنے حضرت صاحب سے مجھے دو تین منٹ لے دیں ۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کر دی ۔

جب میرے عزیز دوست نے اپنے حضور سے یہ خواہش ظاہر کی تو ارشاد ہوا ۔ "دو تین منٹ کیا ۔ دو تین گھنٹے !" یہ فرما کر حلقۂ احباب سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک گوشہ میں آ کر تشریف فرما ہو گئے ۔ میری طرف ایک گاؤ تکیہ بڑھاتے ہوئے اطمینان سے بیٹھنے کا مشورہ دیا ۔

بہر حال مجھے ان بزرگ میں وہ تبلیغی اخلاق جلوہ گر نظر آیا جو اہلِ حق کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ چنانچہ میں انتہائی بیباک طبیعت رکھنے کے باوصف مؤدب ہوگیا۔ لیکن اس سراپا تقدس ہستی نے میرے دو زانو بیٹھنے پر اعتراض کیا۔ ارشاد ہوا بالکل بے تکلف ہو کر بیٹھو۔ یہاں تکلف سے بیٹھنا بے ادبی ہے۔ بے تکلف بیٹھنا نہیں۔ وہ اس لئے کہ باتکلف بیٹھنے سے دھیان تکلیف میں رہتا ہے۔ اور بات پوری توجہ سے نہیں سنی جاتی۔ بزرگانِ دین کی بات پوری توجہ سے نہ سننا گستاخی نہیں تو اور کیا ہے۔ لہذا میں مربع ہو کر بیٹھ گیا۔ اور گاؤ تکیہ سے ٹیک لگالی۔

جب اس طرف سے اطمینان ہوگیا۔ تو آپ نہایت پُر خلوص لہجہ میں گویا ہوئے مانگو، کیا مانگتے ہو۔ یہاں سے ملیگا۔ مجھے پہلے تو اس پیشکش پر تعجب ہوا اور میں جھجکا۔ لیکن جب میں نے چہرے کی متانت اور آنکھوں کے خلوص پر نظر کی تو میری جھجک دور ہوگئی۔ میں نے جواباً عرض کیا۔ حضور کسی ایک بڑے دربار میں پیش ہونا ہے اور پلّے کچھ نہیں ہے۔ لہذا توفیق چاہیے۔

فرمایا کیا توشہ (زادِ آخرت) چاہیے۔ میں نے عرض کیا حضور توشہ محدود لفظ ہے۔ اس سے بھی کوئی بڑی چیز چاہیے۔ فرمایا پھر کیا چاہیے۔ میں نے عرض کیا۔ قرآنِ حکیم کی خدمت۔ ارشاد ہوا کیا چھاپ کر تقسیم کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے عرض کیا۔ نہیں حضور۔ یہ کام تو دوسرے بھی کر رہے ہیں۔ میں تو وہ کام کرنا چاہتا ہوں جس کی توفیق دوسروں کو بہت کم ملی ہے۔ ارشاد ہوا وہ کیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں تقریباً تیئیس چوبیس سال سے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ میں اس سماوی صحیفہ کو پوری طرح سمجھ چکا ہوں۔ البتہ جس قدر سمجھا ہوں اُسے عام کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ سُن کر مسرت

کا اظہار فرمایا اور شانے پر تھپکی دیتے ہوئے فرمایا خدمت کرو یہ توفیق یہاں سے ملے گی۔ لیکن یہ بات چھپانے کی تو نہیں ہے۔ اس گفتگو میں سب کو شامل کر لینا چاہیے۔ یہ فرما کر سب رفقاء کو آواز دے کر بلا لیا۔ جب وہ سب قریب آگئے تو ارشاد ہوا۔ ہاں، یہ تو بتائیں کہ آپ کی قرآن حکیم تک کیسی رسائی ہوئی ہے۔ کسی ایک آدھ مقام کی نشاندہی فرمائیں۔

میں نے جواباً عرض کیا کہ قرآن حکیم کی آیاتِ مقدسہ دو حصوں میں منقسم ہیں۔ اُن میں سے ایک محکمات اور دوسری متشابہات ہیں۔ لیکن میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں۔ کوئی آیت متشابہ نہیں ہے۔ سب آیات محکم ہیں۔ صرف زمانہ اور جغرافیائی حدود (TIME & SPACE) کا فرق پڑتا ہے۔ جب متعلقہ آیت اپنے وقت اور مقام کو پا لیتی ہے تو وہ متشابہ سے محکم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آیت کسی ایک زمانہ اور دوسری کسی ایک قوم کے لئے متشابہ ہو۔ لیکن کسی دوسرے زمانہ اور دوسری قوم تک پہنچ کر محکم ہو جائے۔ ہمیشہ کوئی آیت متشابہ نہیں رہ سکتی۔ وہ اس لئے کہ اللہ کی یہ کتاب قیامت تک کے لئے ہے۔ اور ہر قوم کے لئے ہے۔ اس کا پیغام کسی طرح بھی ایک قوم اور زمانہ تک محدود نہیں رہ سکتا۔ یہ صحیفۂ الہٰی ہر زمانہ کی ترقی کا ساتھ دیتا ہے۔ اور ہر قوم کی عملی مشکلات کو سلجھاتا ہے۔

استفساراً ارشاد ہوا، مثلاً ؟

میں نے مثال کی غرض سے عرض کیا کہ نظام بطلیموسی کی رُو سے تمام ہیئت دان یہ مانتے تھے کہ سُورج ساکن ہے اور دوسرے تمام اجرامِ فلکی اس کے گرد

گھوم رہے ہیں۔ لیکن قرآنِ حکیم نے اگر یہ دعویٰ کیا کہ "الشمس تجری لمستقر لہا" یعنی سورج اپنی جائے قیام کی طرف بڑھ رہا ہے۔

جب ہیئت دانوں نے یہ دعویٰ سنا تو وہ یہ طعنہ دینے لگے کہ یہ ہے مسلمانوں کا خدا جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ سورج ساکن ہے یا متحرک، کم وبیش ساڑھے بارہ سو سال تک مسلمانوں کو یہ طعنہ ملتا رہا۔ لیکن کسی مردِ خدا کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ کہ وہ عملی تجربہ کے ذریعہ قرآنِ حکیم کی سچائی کے لئے ثبوت فراہم کر دیتا۔ حالانکہ ان کے علوم وفنون سے آج بھی مغرب اپنی تشنگی دُور کر رہا ہے۔

آخر اس کی توفیق ملی تو ایک غیر مسلم جرمنی کے "ہرشل" کو جسے ہم اپنی اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ اس نے آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے مسلسل تجربات کر کے ثابت کر دیا کہ سورج بھی حرکت پذیر ہے۔ لیکن اس کی حرکت وہ نہیں جو دیگر اجرامِ فلکی کی ہے۔ لہٰذا آیت خود بخود محکم ہو گئی۔

جب میں یہ عرض کر چکا اور سکوت اختیار کر لیا تو حضرت صاحب نے اپنی نظروں کو بلند کیا اور فرمایا۔ کچھ اور بیان کرنا ہے۔ یا بس۔ میں نے عرض کیا بس حضور۔

اس کے بعد آپ نے نہایت متانت سے لب کشائی فرمائی اور یوں گویا ہوئے — "بات کے دو پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ غیر مسلم کو توفیق کیوں ملی مسلمان کو کیوں نہیں ملی۔ دوسرا یہ کہ سورج اپنی حیثیت سے اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ وہ ساکن رہ سکے۔ پہلی شق کا جواب قانونِ شہادت کے تحت ہے۔

اور دوسری کا تصوّف کے تحت۔

قانونِ شہادت کی رُو سے شہادت ہمیشہ غیر کی معتبر ہوتی ہے۔ اپنے کی نہیں۔ لہٰذا اگر تمام اکابرینِ امّت بھی مل کر قرآنِ حکیم کے نظریہ کی تائید کرتے تو بطلیموسی نظریہ کو نہ جھٹلا سکتے۔ وہ اس لئے کہ مسلم اور غیر مسلم ہیئت داں دو گروہوں میں بٹ جاتے۔ مسلمان حقیقت بیان کرتے اور غیر مسلم جس طرح ہٹ سے قرآنِ کریم کی دوسری صداقتوں کو صحیح جان کر بھی عملاً تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح اس نظریہ کو بھی رد ہی کئے جاتے۔ اب اس کی شہادت غیر شعوری طور پر ایک غیر مسلم نے فراہم کر دی ہے۔ لہٰذا امرِ سے پہلا نظریہ ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ اللہ کے نزدیک "ہرشل" ہو یا کوئی مسلمان اس کے سب بندے ہیں۔ جس بندے سے وہ جس طرح مناسب سمجھتا ہے کام لے لیتا ہے۔

دوسری شق کے سلسلہ میں یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ایک مطلوب ہے اور باقی کائنات کی ہر شئے اس کی طالب ہے۔ اس مقام پر ذرا سکوت فرما کر ارشاد ہوا۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ مطلوب کون ہے۔ پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا وہ مطلوب انسان ہے۔ لہٰذا ہر شئے اس کی تلاش میں ہے اور اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ اس طرح مطلوب ہر شئے (ہر طالب) سے متمتع ہو رہا ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ طالب کبھی ساکن نہیں رہ سکتا۔ اس لئے سورج جو کائنات میں جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیسے ساکن رہ سکتا ہے۔ اس حقیقت کی رُو سے بطلیموس کا نظریہ پہلے ہی بنیادی خامی

کا حامل تھا۔ اسے ردّ ہونا ہی چاہیے تھا۔

اس کے بعد صانعِ فطرت نے انسان کو طالب بنایا اور خود مطلوب بن گیا۔ لہذا انسان اس کی طلب میں لگا ہوا ہے۔ اور متحرک ہے۔ جب تک اس صحیح اور وضعی صورت میں نظام چلتا رہتا ہے تو انسان "احسنِ تقویم" بنا رہتا ہے۔ اور حضرت جلال الدین رومیؒ کے الفاظ میں کہتا رہتا ہے ؎

ما زفلک برتریم، وز ملک افزوں تریم

زیں دو چرا نگذریم، منزلِ کبریاست

جب وہ اپنی نادانی اور کم فہمی سے اپنی طالب کسی شئے کا خود طالب ہو جاتا ہے تو صورتِ حال منقلب ہو جاتی ہے۔ طالب مطلوب ہو جاتا ہے اور مطلوب طالب ہو جاتا ہے۔ یعنی خادم مخدوم اور مخدوم خادم بن جاتا ہے۔ اور یہ بہت ہی حسرت و افسوس کا مقام ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی پستی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ اور اس پر "ثُمَّ رَدَدنٰہُ اَسفَلَ سٰافِلِین" کا مقام آ جاتا ہے۔ اور محنت و مشقت اس کا مقدّر ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ پکارنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی چیخیں اور کراہیں گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ پھر یہ تمام اباطیل کے سہارے لینا چاہتا ہے۔ لیکن حق اور حقیقت کے مقابلے میں کون کسی کی مدد کر سکتا ہے۔

لہذا ہر ذی فہم انسان کو یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے مطلوب ہی کی طلب میں لگا رہے۔ دنیا اور اس کے متعلقات کی طرف اس طرح نظر نہ کرے کہ اس کا مطلوب اس کی نظر سے اوجھل ہو جائے۔ چنانچہ کہا گیا

ہے ؎

حضوری گر ہمیں از و غائب مشو حافظ

متیٰ ما تلق من تہوا دع الدنیا و اہملہا

جب یہ سلسلۂ گفتگو ختم ہوا تو میں حیران رہ گیا۔ اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ ولی ناآشنائے علم نہیں ہوتا۔ علم اسے کہتے ہیں۔ محض کتاب و شنید ہی کا نام علم نہیں ہے۔

اس کے بعد حضور نے ارشاد فرمایا۔ فکر نہ کرو تمہاری دلی خواہش یہاں سے پوری کر دی جائیگی۔ اور ہوا بھی یہی۔ ابھی بیعت کئے ہوئے دس روز بھی نہیں گذرنے پائے تھے کہ وہ کام جس کا میں دس سال کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا دس دن میں تکمیل پذیر ہو گیا۔ اس عطا سے متاثر ہو کر میں نے وہ نظم لکھی جو آئندہ صفحات پر درج ہے۔

مرشدِ کامل

○

طلوعِ فکر سے ہوتی نہ تھی رنگین سحر ابتک
منوّر نور سے ہوتے نہ تھے یہ بام و در ابتک

تعیّن کر نہ سکتی تھی نظر کچھ علم و عرفاں کا
مطالب کے لیئے سمجھا کیئے زیر و زبر ابتک

عطائے علمِ ظاہر تو فقط نورِ بصارت تھا
نظر اپنی بصیرت سے نہیں تھی معتبر ابتک

کتابی علم سے ممکن نہ تھی تکمیل وجدانی
کوئی رہبر اگر ملتا تو مل جاتی ڈگر ابتک

حجابِ عظمتِ حق تک پہنچکر سہم جاتے تھے
نگاہِ شوق کا محور رہے شمس و قمر ابتک

جُدا رہ کر حقیقت سے گنوا دی عمر مکتب میں
اگر عرفان پا لیتے تو مل جاتا ثمر ابتک

نظر کی کار فرمائی سے ہم غافل رہے صد حیف
اگر جذبِ دروں پاتے نہیں رہتی کسر ابتک

بہت دشوار تھا اپنا حقیقت آشنا ہونا
خرد کی نارسائی تھی الجھتی تھی نظر ابتک

ہزاروں ظلمتیں چھائی ہوئی تھیں روح پر اپنی
سخن سازی کی دھن میں تھے نہ تھی دل کی خبر ابتک

حقیقت آشنا منزل بمنزل بڑھتے جاتے تھے
ہمیں غافل رہے پہنچے نہیں اُن تک مگر ابتک

مقدمہ

عطائے حق نے بڑھکر رہبری کردی حقیقت تک
یہ ان سے ایک احسان ہے ہوئے ہیں جسقدر ابتک

مسِ ناقص کو بخشے زر کی صورت اک توجہ سے
نہیں دیکھا تھا عالم میں نظر کا یہ ہنر ابتک

رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے نور کی مانند
صحافی مرشدِ کامل کی باتوں کا اثر ابتک

حرفِ اختتام

میری عقیدت میں اس وقت اور اضافہ ہوگیا جب مجھے حضور نے اپنے لطفِ خاص سے ایک طویل عرصہ تک اپنی خدمت میں رہنے کا شرف بخش دیا۔

عموماً ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی بزرگ شخصیت کے ساتھ شب و روز اس طرح رہا جائے کہ اس کی خلوت و جلوت نظر میں رہے تو حقیقت نہ ہونے کی صورت میں احتیاط کی تمام بندشیں ڈھیلی پڑجاتی ہیں۔ اور کچھ ایسی خامیاں علم میں آجاتی ہیں کہ انہیں انسانی کمزوریاں کہنے کے سوا اور کسی طرح نظرانداز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن یہاں بالکل مختلف کیفیت نظر آئی۔ ہمارے شیخ کی سرے سے کوئی خلوت ہے ہی نہیں۔ سب جلوت ہی جلوت ہے۔ اور خلوت ہو بھی کیوں۔ جب اچھے کام کرنے ہوں اور دوسروں کو مثال بن کے دکھانا ہو تو ان کا اخفا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ شرابِ حقیقت ہے جو چھپ کر نہیں بانگ چنگ پینے کا حکم ہے۔

میں نے حضور کے ساتھ رہ کر ان کی تمام حرکات و سکنات میں علم کو جلوہ گر پایا ہے۔ آپ قول سے، عمل سے، علم سے اور اخلاص سے ہر طرح

عالم ہیں۔ اور خلقِ خدا سے جو محبت و شفقت ہے۔ اسے بیان کرنا الفاظ کے بس کی بات نہیں ہے۔

بہر حال یہ مقامِ شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندۂ ناچیز کو اس مقدّس ہستی کی قدمبوسی کا شرف عطا فرمایا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم پر اپنے قدم رکھ کر منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ میری زندگی بھر کی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ اس کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف عطا فرمائے جو اس کی مخلوق سے خود والہانہ محبت کرتا ہو اور اسی کا درس دیتا ہو ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

لہٰذا یہ آرزو پوری ہو گئی۔

لاہور
۱۴ اکتوبر ۱۹۶۷ء

ابو مسلم صحافی

○

وہ طلوعِ صبح کی سرخی ہو یا ہو رنگِ شام
ایک ہی ہوتا ہے فطرت کے رسولوں کا پیام

جب کسی خطۂ ارض میں کوئی نئی شخصیت ابھرتی ہے تو اس منبعِ فیض کے گرداگرد لوٹ کر تشنہ کامانِ ہستی جمع ہو جاتے ہیں۔ کوئی کچھ پوچھتا ہے تو کوئی کچھ۔ اس طرح سوالات و جوابات کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے وہ اہلِ نظر جن کا تعلق محض معقولات یا فلسفہ و منطق وغیرہ سے ہوتا ہے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مخاطب کے ذہن پر اپنا تسلّط جما لیں اور مسکت جوابات دے کر اس کے قوائے عقلیہ اپنی گرفت میں لے لیں خواہ اس کا دل مطمئن ہو یا نہ ہو۔

اس کے علی الرغم وہ لوگ جو جذبات کا کھیل کھیلنا جانتے ہیں دلوں کو اپنا نشانہ بنا لیتے ہیں اور عقل کو غیر مطمئن چھوڑ دیتے ہیں۔ تمام فنونِ لطیفہ والوں بالخصوص شعراء کا یہی شعار ہے۔ لیکن وہ پاکان ہستی جو اہلِ حق کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اپنے حسنِ بیان سے زندگی کے سنگین حقائق کو کچھ ایسے سیدھے سادے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اپنے مخاطب کے دل و دماغ کو یکساں طور پر مطمئن کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ، شعراء وغیرہ کے بیانات کو عملی زندگی میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی جو ان کے فرمودات کو ہوتی ہے۔ یہی وہ ہستیاں ہوتی ہیں جن سے جہان کو ثبات ملتا ہے۔ اور انہی کی ضو سے جبینِ کائنات پُرضیا رہتی ہے۔ نہ یہ خود تاریکیوں میں رہتے ہیں اور نہ کسی کو رہنے دینا پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اِستفسارات و جوابات

سوال ۔ اہلِ حق کی تعریف کیا ہے ۔

جواب ۔ جن کے شیوۂ صبر پر حرام اور شیوۂ شکر پر حلال غالب نہ آسکے ۔

وضاحت ۔ جب حدودِ شرعی کے اندر رہ کر حرام کھانا جائز ہو جائے تو اہلِ حق اس وقت بھی دامنِ صبر کو تھامے رہتے اور حرام حلال میں تمیز برقرار رکھتے ہیں ۔

شیوۂ شکر پر حلال غالب نہ آسکنا یہ ہے کہ جب حلال کمائی میں سے بطور شکرِ حق خیرات، زکوٰۃ اور صدقہ وغیرہ نکلتا ہو تو فوراً ادا کر دیتے ہیں ۔ اور انہیں کوئی لالچ دامنگیر نہیں ہوتا ۔

وہ "یوم السبت"† کے حیلوں سے ہمیشہ بچتے ہیں ۔

سوال ۔ مردہ اور زندہ کی تعریف فرمائی جائے ۔ اہلِ حق اس میں کیا فرق کرتے ہیں ۔

جواب ۔ بے حقیقت کو اہلِ حق مردہ اور باحقیقت کو زندہ سمجھتے ہیں ۔

سوال ۔ حقائق کی ابتدا کیا ہے ۔

جواب ۔ مسلمان کا ہاتھ امین اور زبان برائی سے پاک ہو ۔

سوال ۔ حقائق کی انتہا کیا ہے ۔

جواب ۔ مسلمان اللہ تعالےٰ کے لئے پاک اور محبوب صلعم کے لئے باوضو رہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ کے نام کو بلند کرے اور اس کے محبوبؐ پر درود اور صلوٰۃ وسلام جاری وساری رکھے ۔ اس کی شہادت ہاتھ کو امین اور زبان کو برائیوں سے پاک رکھ کر دے ۔

---

† یہود سے اللہ تعالےٰ اس لئے بھی ناراض تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی ادائی میں مکروحیلہ سے کام لیا کرتے تھے ۔ "یوم السبت" کا واقعہ ان میں سے ایک ہے ۔ اللہ تعالےٰ نے حکم دیا تھا ۔ کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار مت کیا کرو ۔ لیکن ان کے امتحان کی غرض سے اسی دن دریا میں مچھلیاں کثرت سے آنے لگیں ۔ جب انہوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے ہفتہ کو دریا میں بند لگانا شروع کر دیا اور اتوار کو مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں جو ہفتہ کو شکار کرنے کے مترادف تھا ۔ اللہ تعالےٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی ۔ اور انہیں تنبیہہ فرمائی ۔

سوال ۔ کیا اللہ تعالے مسلم اور کسی غیر مسلم نیک انسان میں تمیز روا رکھتا ہے ۔

جواب ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلعم کے ساتھ کوئی طرف روا نہیں رکھی ۔ اسی طرح محبوبؐ کی بدولت انسانوں کے ساتھ بھی کوئی طرف نہیں رکھی ۔ وہ "رب العالمین" اور اس کا محبوبؐ "رحمتہ للعالمین" ہے ۔ انسان خواہ کسی سرزمین کا ہو یا کسی قوم سے بھی تعلق رکھتا ہو جو حقائق† کی ابتدا کو مان لیتا ہے ۔ وہ انسان اللہ کا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے ۔

سوال ۔ انسان کو جو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے ۔ اس کا شرف کیا ہے ۔

جواب ۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں ان کے ساتھ مل جاؤ ۔ اس طریقہ سے اللہ تعالےٰ سے مل جاؤ گے ۔ اور اللہ تعالےٰ سے مل جانا انسانی شرف ہے ۔ اس سے غیر سے دوری اور غیر سے حضوری ہو جاتی ہے ۔ جس انسان کو یہ حاصل ہو جائے وہ اپنی بلندی کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے ۔

سوال ۔ ناموافق حالات میں کیسے زندگی بسر کرنی چاہیئے ۔

جواب ۔ دو پہلو ہر ایک انسان کے سامنے رہتے ہیں ۔ مطابق اور غیر مطابق ۔ جو لوگ حقیقت آشنا نہیں ہوتے وہ مطابق کو مطابق اور غیر مطابق کو غیر مطابق جانتے ہیں ۔

لیکن وہ خواص جن کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے وہ مطابق کو مطابق جانتے ہیں ۔ اور غیر مطابق پر تحمل کرتے ہیں ۔

اور اس سے بھی بڑھ کر جو حقیقت آشنا خاص الخاص کا درجہ رکھتے ہیں وہ مطابق کو بھی منجانب اللہ سمجھتے ہیں اور غیر مطابق کو بھی ۔ لہٰذا وہ "ہر چہ آید از دوست نکوست" کو پیش نظر

---

† حقائق کی ابتدا یہ ہے کہ ہاتھ امین اور زبان برائیوں سے پاک ہو ۔

رکھتے ہیں ۔

سوال ۔ دنیاوی تکالیف کن اسباب کا نتیجہ ہیں ۔

جواب ۔ دنیاوی تکالیف کا واحد سبب یہ ہے ۔ کہ ساری مخلوق ماضی اور مستقبل میں رہتی ہے ۔ جو چلا گیا اس کا غم کھاتی ہے ۔ اور جو پاس نہیں اس کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے ۔ لہٰذا جو حال پر عطا ہو رہا ہوتا ہے ۔ اس سے بے خبر اور دور رہ کر غموں میں گھلتی رہتی ہے جو اپنے حال سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے وہ کبھی دنیاوی تکالیف کا شکار نہیں ہوتا ۔

سوال ۔ دنیاوی تکالیف کے ازالہ کی کیا صورت ہے ۔

جواب ۔ صرف یہی کہ جو اللہ تعالیٰ حال پر دنیا نہیں چاہتا ۔ اس کی تمنا ہرگز نہ کی جائے ۔ یعنی ماضی و مستقبل کو اپنی تمناؤں کا مرکز نہیں بنانا چاہیئے ۔ جو کچھ حال پر مل رہا ہو اس کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیئے ۔ اور مکمل طور پر راضی برضا رہنا چاہیئے ۔

شکریہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قول سے ادا کیا جائے ۔ اور پھر اعمال سے اس کو حال کہا جاتا ہے ۔ محض زبان سے شکریہ کی ادائگی کافی نہیں ہوتی ۔

مزید وضاحت کے لئے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کی عطا کی ہوئی نعمت جس وقت عطاءاللہ تعالیٰ کے راستہ میں لگ جائے ۔ تو شکریہ ادا کرنے والا پہلے اس سائل کا شکریہ ادا کرے جسے وہ نعمت کی امانت سونپی گئی ہے ۔

یہ اس لئے ہے کہ حق حقدار کو پہنچ چکا ہے اور اس نعمت کا صحیح مصرف ہو گیا ہے ۔ اگر وہ سائل ایسا نہ کرتا تو وہ امانت کسی غیر مصرف میں آ کر رضائے الٰہی کے خلاف نتائج پیدا کر دیتی ۔ وہ اس لئے کہ جانیوالی چیز کبھی پاس نہیں رہا کرتی اگر وہ صحیح ہاتھوں میں نہیں جائیگی ۔ تو یقیناً غلط ہاتھوں میں چل جائیگی ۔ لہٰذا حق حقدار کو پہنچ جائے

تو وہ عمل صالح ہے اور قابلِ شکر بھی۔

سوال۔ آدمی میں انسانیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

جواب۔ جب آدمی کی نیت درست ہو جاتی ہے تو اس کی حقیقت درست ہو جاتی ہے۔ اور جب اس کی حقیقت درست ہو جاتی ہے۔ تو اس کا عقیدہ درست ہو جاتا ہے۔ جب عقیدہ درست ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال بھی درست ہو جاتے ہیں۔ بس اعمال کی درستی ہی کا نام انسانیت ہے۔

سوال۔ مومن اور کافر کی پہچان کیا ہے۔

جواب۔ کافر جس حال میں بھی رہیگا، اس کے پیشِ نظر دنیا ہی رہیگی۔ لیکن مومن اوّل تو دنیا کی خواہش ہی بہت کم کرے گا۔ اور اگر کرے گا بھی تو وہ دین ہی کے لئے کریگا۔ اور بس۔

سوال۔ اعمال کی روح کیا ہے۔

جواب۔ محبت۔ واضح رہے کہ اس میں مجازی اور حقیقی کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

سوال۔ کبریا سے ملنے کا کیا طریقہ ہے۔

جواب۔ جن سے کبر دور ہو جاتا ہے۔ انہیں کبریا مل جاتا ہے۔

سوال۔ گریہ وزاری کا مقام کیا ہے۔

جواب۔ گریہ وزاری دو حال پر مبنی ہوتی ہے۔ یا تو اس کا سبب فراق ہوتا ہے۔ یا پھر وصال۔ دوسری حالت میں فرطِ انبساط سے سالک کے جذبات میں طغیانی آ جاتی ہے اور آنسو خود بخود جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ رونا پہلے رونے سے افضل ہے۔

سوال۔ قرآن اور سنّت کی موجودگی میں ہادی کی کیا ضرورت ہے۔

جواب۔ قرآن و سنّت کے براہِ راست مطالعہ سے ہدایت تو ممکن ہے لیکن نورِ ہدایت ممکن نہیں۔ نورِ ہدایت صرف ہادی ہی کے پاس ہوتا ہے۔

ہدایت کی حد تک خطرہ موجود رہتا ہے۔ اگر نورِ ہدایت حاصل ہو جائے تو سالک خطرہ سے گذر جاتا ہے۔ ہدایت دعویٰ ہے اور نورِ ہدایت شاہد ہے۔ جس دعوے کا کوئی شاہد نہ ہو وہ دعویٰ قابلِ سماعت نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے دل کی آنکھ کھولنے کے دو ہی مقام رکھے ہیں۔ ہدایت اور نورِ ہدایت۔ ہدایت عمل ہے اور نورِ ہدایت علم ہے۔

سوال۔ دین اور دنیا میں کیا فرق ہے۔

جواب۔ دین اور دنیا میں نہایت لطیف سا فرق ہے۔ اگر دنیا اور اس کے متعلقات کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اس کی منشا کے مطابق استعمال کیا جائے تو سب کچھ دین ہے۔ اور اگر ذاتی ملکیت سمجھ کر اپنے منشا کے مطابق استعمال کیا جائے تو کچھ ہم دنیا ہے۔ عمل کی خواہ کوئی صورت ہو۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا کی جملہ نعمتیں مثلاً علم، ذہانت، قوائے جسمانی، دولت و ثروت، جاہ و جلال، رسوخ و اقتدار عین دین ہیں۔ اگر ان کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اسی کے منشاء کے مطابق ان سے کام لیا جائے۔ اور اگر ذاتی ملکیت سمجھ کر اپنے منشاء کے مطابق انہیں استعمال میں لایا جائے تو یہ سب دنیا بن جائیگی۔

اس مقام پر یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محبوب کی بدولت امین بنا کر بھیجا ہے۔ سب نعمتیں امانت ہیں۔ اور عطا ہیں

ذاتی نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب کو اللہ تعالٰی کی امانت سمجھ کر اسی کے منشاء کے مطابق ان سے کام لیا جائے۔ تو یہ عین شکرِ حق ہے۔ بصورت دیگر کفرانِ نعمت۔ جو خدا کو کسی طرح پسند نہیں ہے۔

سوال۔ نعمت کا شکریہ کس طرح ادا ہونا چاہیئے۔

جواب۔ ہر نعمت کا شکریہ اس کی شان اور نوعیت کے مطابق ادا ہونا چاہیئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ نعمت کو مستحقین میں تقسیم کیا جائے۔ حرف قول کے ذریعہ شکریہ ادا نہیں ہوگا۔ مثلاً ایک شخص کو اللہ تعالٰی نے اقتدار عطا فرمایا ہے۔ تو اس کا شکریہ اس طرح ادا ہوگا۔ کہ اس کے اقتدار سے خلقِ خدا کے حقوق کی حفاظت ہو یا کسی ستم رسیدہ کو کسی مصیبت سے نجات مل سکے۔

سوال۔ طلبِ صادق سے کیا مراد ہے۔

جواب۔ طلبِ صادق کا مطلب یہ ہے کہ تم دوست کو اسی کے مفاد کے لئے چاہو۔ دوست کو چاہنے میں تمہاری کوئی ذاتی غرض نہ ہو۔ دوست کے ساتھ دوستی کرو دوست کے لئے۔ اپنے لئے مت کرو۔ کیونکہ مسلمان کی دوستی اور دشمنی صرف اللہ تعالٰی کے لئے ہی ہوتی ہے۔

سوال۔ انسانیت کی معراج کس عمل سے شروع ہوتی ہے۔

جواب۔ انسانیت کی معراج مخالف کے ساتھ موافقت کرنے سے شروع ہوتی ہے۔ دوست کے ساتھ دوستی کرنا یہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔ مخالف کے مطابق رہنا یہ مروّت ہے۔ مقامات اور مدارج کے لحاظ سے

- مطابق کے مطابق رہنا شریعت ہے۔
- غیر مطابق کے مطابق رہنا یہ طریقت ہے۔
- مطابق اور غیر مطابق دونوں حالتوں کو منجانب اللہ جاننا یہ حقیقت ہے۔
- اور تمام مقامات پر راضی برضا رہنا یہ معرفت ہے۔

سوال۔ علم حقیقی کب عطا ہوتا ہے۔

جواب۔ علم حقیقی کی عطا کے لئے پہلے شریعت، پھر طریقت، پھر حقیقت اور پھر معرفت عطا ہوتی ہے۔ اور عملی شکل کے لئے پہلے سالک کو قول، اس کے بعد عمل اور اس کے بعد علم عطا ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت کے لئے یوں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ جب عمل سچا ثابت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالٰی کے دربار سے اس سچے عمل کو علم کی آنکھ عطا ہو جاتی ہے۔ بس یہی علم علمِ حقیقی ہوتا ہے۔ سارے مقامات کا علم اللہ تعالٰی کے پاس ہے۔ اور اللہ تعالٰی کے بندے کے پاس تسلیم و رضا ہے۔ کیونکہ مومن کی شان شانِ تسلیم ہے۔

اس لحاظ سے یہ واضح رہنا چاہیئے کہ قول، عمل اور علم یہ مقامات ہیں ہیں اور اخلاص ان کا انعام ہے۔ معرفت فرمان ہے۔ یعنی فرمان اللہ تعالٰی کا۔ اللہ تعالٰی کا فرمان کیا ہے؟ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ جس کو میں سب سے زیادہ انعام عطا کرنا چاہتا ہوں۔ اُسے اپنا علم عطا فرما دیتا ہوں۔ اور اسے سمجھنے کی توفیق بھی عطا فرما دیتا ہوں۔ علم حقیقی صرف اسی وقت عطا ہوتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کی بدولت اپنے بندے کو عطا کر دینا چاہتا ہے۔ وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلعم کو اپنا علم عطا فرمایا ہے جو علم حقیقی ہے۔

قول ماضی کیلئے ماضی ہے۔ حال کیلئے حال ہے اور مستقبل کیلئے مستقبل ہے۔ لیکن اہلِ حق کے نزدیک قول ماضی ہی رہتا ہے۔ ان کے یہاں حرف عمل کو حال کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ رہا علم اسے حال کا درجہ بھی حاصل ہے، اور مستقبل کا بھی۔ یہ سالک کی اپنی کیفیاتِ مقام پر موقوف ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قاعدہ کے مطابق علم حقیقی واردات کے بعد ہی عطا ہوتا ہے۔ اس کے ماسوا جو علم ہوگا وہ محض قیاسی وظنی ہوگا جو کسی بھی صورت سے حقیقی نہیں بن سکتا۔

سوال۔ انسان صاحبِ حال کس طرح بن سکتا ہے۔

جواب۔ انسان صاحبِ حال اس وقت ہوتا ہے جب ماضی کا شکریہ ادا کرے۔ حال پر صابر رہے اور اپنے مستقبل سے پاک رہے۔

وضاحت کے لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ تمام مخلوق ماضی اور مستقبل میں رہتی ہے۔ اس کائنات کا ہر فرد جو چلا گیا ہے اس کی یاد اور جو آنے والا ہے اس کی تلاش میں رہتا ہے۔ اور حال سے کوئی خاص سروکار نہیں رکھتا ہے۔ اہلِ حق کے نزدیک حال کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پاک رہا جائے اور اس کے محبوب صلعم کے ساتھ باوضو رہا جائے †۔ یعنی اللہ تم کی مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی کیلئے معاملہ رکھا جائے تو

† یعنی مسلمان کا ہاتھ امین اور زبان برائی سے پاک رہے۔ اور حضور صلعم پر زیادہ سے زیادہ صلوٰۃ وسلام بھیجا جائے۔

یہ حال ہے اور اس کے علاوہ جو ہے وہ سب قال ہے۔

حال حقیقت ہے۔ جس نے حال کو تسلیم نہ کیا وہ کبھی بھی صاحبِ حال نہیں بن سکتا۔ یعنی سرِ حقیقت سے آشنا ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ جو کیفیت موجود ہے اُسے خدائی سمجھ کر برضا و رغبت تسلیم کرے تو پھر معنوں کے اعتبار سے اس نے اللہ تعالیٰ کی پسند کو پسند کیا۔ جب یہ ہو جائیگا تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے صاحب کو رازِ حقیقت عطا فرما دے گا۔ اور پھر وہ صاحبِ حال کہلانے کا مستحق بن جائے گا۔

سوال۔ گناہ کی تشریح فرمائی جائے۔

جواب۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز میں مبتلا ہو جانا گناہ ہے۔

سوال۔ کیا بُرے آدمی سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔

جواب۔ بُرے آدمی کی بُری صفت سے دُور رہنا چاہئے۔ لیکن بُرے کے قریب ہو کر اُسے برائی سے بچانا اہلِ حق پر فرض ہے۔ اگر آپ بُرے کے قریب ہو کر اُس پر اپنے اخلاقِ حسنہ کا پرتو ڈال کر اور اُسے بُرائی سے متنفر کر کے راہِ راست پر نہ لا سکے تو آپ مقصود سے دُور رہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ جوابدہ ہوں گے۔

سوال۔ افہام و تفہیم کا احسن طریقہ کیا ہے۔

جواب۔ طعن و تشنیع سے حدّت پیدا ہوتی ہے۔ افہام و تفہیم کیلئے ٹھنڈا ماحول پیدا کیا جائے۔ اگر آپ نے اُس وقت مخاطب کو کسی قسم کا طعنہ دے دیا تو اس کے اندر آگ پیدا ہو جائیگی۔ اب اگر آپ

نہایت قیمتی بات بھی اس سے کریں گے تو وہ آگ جو طعنہ سے اس کے اندر پیدا ہو گئی ہے۔ اس قیمتی بات کو بھی جلا دے گی۔ لہٰذا افہام و تفہیم کے لئے ٹھنڈا ماحول نہایت ضروری ہے۔

اس کے علاوہ مبلغ کا کردار بھی ایسا ہونا چاہئے۔ جیسا کہ صاحب النور حضرت میاں خدا بخش رح سرتاجِ اولیاء فرماتے ہیں۔ "بیٹا! فقیر کی زبان نہیں بولتی عمل بولتا ہے" سب سے پہلے جو کام کسی دوست کو کہنا چاہتے ہو پہلے خود اس کا نمونہ بنو جس وقت آپ ہیں وہ مقامات پائے جائیں گے تو دیکھنے والا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خود بخود آپ کا نمونہ بن جائیگا۔

سوال۔ کلام کرتے وقت کیا احتیاط برتی جایا کرے۔

جواب۔ کلام کرتے وقت دوسرے کے فہم و فراست کو ملحوظ رکھنا چاہئے ورنہ اس کے عمل پیرا نہ ہونے کی ذمہ داری کلام کنندہ پر ہوگی۔ اس کی مثال یوں سمجھ لی جائے کہ ایک بچہ دس سیر وزن اٹھانے کے قابل ہے اگر اس سے اِس سے زائد وزن اٹھوانے کی کوشش کی جائے گی تو قصور وزن اٹھوانے والے کا ہوگا بچہ کا نہیں۔

کلام کرتے وقت دوسرے کے فہم و فراست کو ایسے ہی ملحوظ رکھو جس طرح والدین بچے کا خیال رکھتے ہیں۔

سوال۔ مخلوق سے حسنِ سلوک کا کیا طریقہ ہونا چاہئے۔

جواب۔ موجود کی خبر لو۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے حضور میں چلا جائے اس کے لئے دعائے مغفرت کرو۔

جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ اسے حق تعالیٰ سے وہ صفات عطا ہو جاتی ہیں جو اس نے اپنے محبوب صلعم کو مرحمت فرمائی ہیں۔ چونکہ وہ صفات موجود رہنے والی ہیں۔ اس لئے وہ انسان بھی معنوی اعتبار سے موجود رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر صفات موجود رہیں۔ تو صفات والا بھی موجود رہتا ہے۔

باصفت کی صفت کو جو پا لیتا ہے وہ جس کی وہ صفت ہے دونوں ایک جگہ پائے جاتے ہیں۔ خواہ ان دونوں کے درمیان زمانہ کا اور فاصلہ کا کتنا ہی بعد کیوں نہ ہو۔ علاوہ ازیں صفت پانے والا جس وقت کسی صفت میں حلول کر جاتا ہے تو وہ مجسم وہی بن جاتا ہے جس کی وہ صفت ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ پاک ہے جو انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ پاک ہو جاتا ہے † ۔ اس انسان کی کثافت والی سب صفات معدوم ہو جاتی ہیں اور لطیف صفات اسے عطا ہو جاتی ہیں۔ انسان فانی ہے اللہ تعالیٰ باقی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی پاکی کی بدولت لگ جاتا ہے

† تقدس مآب اعلیٰ حضرت سلطان الحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ پاک ہونے کا یہ طریقہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی بھلائی کے سلسلہ میں اس (مخلوق) سے کوئی غرض وابستہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا جو انسان اللہ کی مخلوق کی بھلائی میں بغیر کسی غرض و غایت کے لگا رہے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پاک ہو جائیگا اور اس کا ادراک اللہ تعالیٰ کا ساتھ ہو جائے گا۔

وہ فنا سے گزر جاتا ہے۔ اسے دائمی بقا عطا ہو جاتی ہے۔

سوال۔ شرکِ خفی کیا ہے۔

جواب۔ مسبب کے بجائے کسی سبب پر انحصار کرنے کو شرکِ خفی کہتے ہیں۔ کسی بھی حالت میں کسی سبب پر انحصار کر بیٹھنا یہ سخت نادانی ہے۔ انحصار کے قابل تو وہ ذاتِ واحدہٗ لاشریک ہی ہے جس نے پالنے اور علم سے پالنے کا وعدہ کیا ہے۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اگر مخلوق اللہ سے معاملہ رکھا جائے گا۔ تو وہ شرک سے پاک ہوگا۔ اور اگر غرض و غایت (مادّی) کو پیشِ نظر رکھ کر مخلوق اللہ سے معاملہ رکھا جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکِ خفی اور اس کے محبوب صلعم کے ساتھ شرکِ جلی ہوگا۔

جس سبب کا نتیجہ رب ہو۔ وہ سبب کامل ہے۔ اور جس سبب کا نتیجہ دنیا ہو وہ سببِ ناقص ہے۔

اس مقام پر یہ غلط فہمی بھی دُور ہو جانی چاہئے کہ بزرگانِ دین سبب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے وہ وسیلہ اور وصال کا دروازہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں رکھا۔ بلاشبہ ساری کائنات کی بسم اللہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اور دین کی بنیاد بزرگانِ دین سے ہے۔

سوال۔ حق تک پہنچنے کے لئے کن مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔

جواب۔ حق بزرگانِ دین کے قدم سے ہے اور حقیقت بزرگانِ دین کے عمل سے معرفت بزرگانِ دین کے اخلاص سے اور اخلاص مخلوق سے ہے۔ یعنی خلق اللہ کے ساتھ اخلاص برتا جائے۔

سوال۔ مومن کے اوصاف کیا ہیں۔

جواب۔ مومن توبہ کرنے والا، عبادت کرنے والا، حمد کرنے والا، روزہ رکھنے والا، رکوع کرنے والا، سجدہ کرنے والا۔ نیک کاموں کا امر کرنے والا۔ بُری باتوں سے منع کرنے والا۔ اور حدوں کی حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ نو مقامات ہیں جو اللہ تعالےٰ نے مومن کے لئے مقرر فرمائے ہیں۔ ان مقامات کی حفاظت کی جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچا ہونے کی تصدیق کردی جاتی ہے۔ اور قرآنِ حکیم کی طرف سے معیاری مومن قرار دے دیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ مومن ہونا دعویٰ ہے اور یہ نو مقامات اس کے شاہد ہیں۔ اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ کوئی دعوےٰ بغیر شاہد کے قبول نہیں ہوتا۔

سوال۔ بزرگانِ دین کن لوگوں کو تحفظ دیتے ہیں۔

جواب۔ اُن کی طرف سے انہی کو بچایا جاتا ہے جو بُرے اعمال سے بچتے ہیں۔ یا بچے ہوؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔

سوال۔ نورِ الٰہی+ کی تعریف کیا ہے۔

جواب۔ جس نور کے دو شاہد موجود ہوں "خوف" اور "رِجا" اسے بزرگانِ دین نورِ الٰہی فرماتے ہیں۔ جس کے دو شاہد موجود نہ ہوں ان کے نزدیک وہ نورِ الٰہی نہیں ہے۔ جو اس کے ماسوا ہوگا۔ وہ علم کسب سے ہوگا اور اس میں تغیّر و تبدّل ہوتا رہے گا۔ اور نورِ الٰہی کے لئے شرطِ اوّل ہے کہ اس میں کسی قسم کا تغیّر تبدل نہ ہو۔

سوال۔ اللہ تعالےٰ کے ساتھ کیسے پاک رہا جا سکتا ہے۔

جواب۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ اپنا ہو کر نہ رہے۔ صرف اللہ تعالےٰ کا ہو کر رہے۔

سوال۔ اللہ تعالےٰ کے رسول کے ساتھ باوضو رہنا کیا ہے۔

جواب۔ مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورۂ حشر) جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے منع ہو جاؤ۔ اس کی شہادت کے لئے زبان کا برائیوں سے پاک ہونا اور ہاتھ کا امین ہونا نہایت ضروری ہے۔

سوال: ہدائت کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔

جواب۔ ہدائت ہادی کے پاس ہوتی ہے۔ اور نورِ ہدائت اس کا مقام

+ یہاں نورِ الٰہی سے مراد علمِ الٰہی یا ہدائت ہے۔ اسے علمِ حقیقی بھی کہا جاتا ہے

ہوتا ہے۔ اس مقام پر واضح رہنا چاہئے کہ سالک ہدائت کی بھی اپنی کوئی صورت نہ رکھے۔ جو رُخ حال پڑ دی کا ہو اسی رخ کو ہدایت سمجھے اور حقیقتاً وہی ہدائت ہوتی ہے ؎

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوئید
کہ سالک بے خبر بنود زراہ و رسم منزلہا
(خواجہ حافظؒ)

سوال۔ صاحبِ قال اور صاحبِ حال میں کیا فرق ہے۔

جواب۔ تقدس مآب اعلیٰ حضرت سلطان الحقیقت نے جواباً ارشاد فرمایا کہ ہمارے شیخؒ فرماتے ہیں کہ صاحبِ حال قول (زبان) سے نہیں بولتا۔ اعمال سے بولتا ہے۔ لہذا ہمارا بھی یہی جواب ہے۔ یعنی جو اعمال سے بولے وہ صاحبِ حال اور جو زبان سے بولے وہ صاحبِ قال ہوتا ہے۔

سوال۔ علمِ الٰہی کیونکر حاصل ہوتا ہے۔

جواب۔ پہلے قول اس کا شاہد عمل، اس کا شاہد علم اور علم کا شاہد اخلاص ہوتا ہے۔ اور اخلاص کو علمِ الٰہی کی سند کا درجہ حاصل ہے۔

سوال۔ قلوب المؤمنین عرش اللہ تعالیٰ کیوں کہا گیا ہے۔

جواب۔ مومن کا دل دلبر کا ہوتا ہے۔ جب دل دلبر (اللہ تعالیٰ) کا ہوگا تو وہ یقیناً کائنات کی ہر چیز سے بڑھ کر عرشِ الٰہی ہی ہو سکتا ہے۔ اور

جس دل کو ایمان کی دولت میسر نہیں ہوگی۔ وہ محض ایک گوشت کا لوتھڑا ہوگا، اور بس۔ وہ اس لئے کہ دل نام کی شئے حیوانوں میں بھی موجود ہے۔

سوال۔ قرآنِ حکیم باعتبار ماضی، حال اور مستقبل کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

جواب۔ قرآنِ حکیم حکم کے اعتبار سے مستقبل اور اعمال کے لحاظ سے حال اور شہادت کے لئے ماضی ہے۔

سوال۔ علمِ حقیقی کیا ہے۔

جواب۔ وہ علم جو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست القا، مشاہدہ اور وحی کے ذریعہ عطا ہو علمِ حقیقی ہوتا ہے۔ کتاب و شنید سے علمِ حقیقی کا حصول نہایت دشوار ہے۔

سوال۔ علم کے کتنے مقام ہیں۔

جواب۔ حصولِ علم کے لئے پہلے قول کے مقام اور پھر عمل کے مقام سے گذرنا پڑتا ہے اس کے بعد علم عطا ہوتا ہے۔ اس کے سوا جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا۔ وہ علمِ حقیقی کا نہیں ہوگا۔ علم کسبی کا ہوگا۔ چونکہ کسب کثافت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس علم کی اقدار بھی مادی ہوتی ہیں۔ اور علمِ حقیقی چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور لطافت سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا اس کی اقدار بھی لطیف ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اخلاص اللہ تعالیٰ کی طرف سے صاحبِ علم کو انعام

کی صورت میں عطا ہوتا ہے۔

سوال۔ بزرگانِ دین کی حاضری میں کیسے بیٹھا جائے۔

جواب۔ چونکہ بزرگانِ دین کی حاضری میں حضوری کا مقام ہوتا ہے۔ اس لئے خاموش رہنا چاہیئے بولنے سے مقام عطا نہیں ہو سکے گا۔

سوال۔ علم اور محبت کا درجہ کیا ہے۔

جواب۔ علم تمام نعمتوں کا خزانہ ہے اور محبت تمام نعمتوں کا معدن ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر معدن کا وجود نہ ہو تو خزانہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

سوال۔ مخلوق کی کتنی قسمیں ہیں۔ اور ان کے بارے میں بزرگانِ دین کی کیا کیا رائے ہے۔

جواب۔ بزرگانِ دین کے نزدیک مخلوق میں† تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور راتوں کو بارہ بجے تک پھرتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے حکم ہے کہ انہیں سُلادو۔ وہ اس لئے کہ وہ وقت محبانِ الٰہی کے اُٹھنے کا ہوتا ہے۔ لہذا انہیں گہری نیند سلا دیا جاتا ہے۔ یہ بدبخت انسان ہوتے ہیں۔ بدبخت انسان کی علامت یہ ہے کہ وہ بستر سے اس وقت اُٹھتا ہے۔

† سورۂ مزمل اس کی شاہد ہے۔

سوال۔ علم پیدا ہونے سے کیا کیفیات وارد ہوتی ہیں۔

جواب۔ علم جس وقت انسان میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اس کے جلوہ گر ہوتے ہی دو راستے بنتے ہیں۔ اگر دین والوں سے میل جول پیدا ہو تو خوفِ الٰہی پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اگر دنیا والوں سے میل جول ہو تو حدّت (غم و غصّہ) میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سوال۔ کیا اہلِ ہوس میں بھی علم جلوہ گر ہو سکتا ہے۔

جواب۔ ہوا و ہوس کا تعلق نفس سے ہے اور نفس عالم نہیں جاہل ہے۔ اسی لئے وہ نفسِ امّارہ ہے۔

سوال۔ جماعت اور فرد کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

جواب۔ قطرہ کی حقیقت سمندر ہے اور سمندر کی حقیقت قطرہ ہے۔

سوال۔ محبّت میں محب کا مقام کیا ہے۔ کیا وہ اپنی+ صورت رکھ سکتا ہے۔

جواب۔ محبّ اپنی کوئی صورت نہیں رکھ سکتا۔ شرطِ محبّت ہی نہیں کہ محب اپنی کوئی صورت رکھے۔

سوال۔ "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا" کیا ہے۔

جواب۔ "تخلقوا باخلاق اللّٰہ" ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو پکڑتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچ جاتا ہے۔

+ خواہش

جب دن کافی چڑھ جاتا ہے۔

دوسرے محبّانِ الٰہی ہیں جنہیں آدھی یا دو تہائی رات گئے جگا دیا جاتا ہے۔ ان کا اٹھنا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہوتا ہے۔

تیسرے اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ ان کے لئے حکم ہوتا ہے۔ کہ ان کے کروٹ بدل دو۔ وہ جب بھی اٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ان کا اٹھنا محبوب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب سب سے پہلے اٹھتا ہے۔ وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب سب سے اوّل ہے اور سب سے آخر ہے۔

سوال۔ بزرگانِ دین کے آنے کا منشا کیا ہے۔

جواب۔ خلق اللہ کو غرض و غائیت سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ واصل کیا جائے۔ صرف یہی منشا ہے اور کوئی نہیں۔

سوال۔ حجاب کی تعریف کیا ہے۔

جواب۔ انسان کے ظاہر یا باطن میں ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جو ایک دوسرے کے ساتھ خلوت میں کرنے کی ہو۔

سوال۔ اہلِ حق کے درجات کیا ہیں۔

جواب۔ ذاکر سے عامل ہوتا ہے۔ عامل سے کامل ہوتا ہے۔ کامل سے مکمّل ہوتا ہے اور مکمّل سے اکمل ہوتا ہے۔ مجذوب مکمّل ہوتا ہے۔ اور سر مست اکمل ہوتا ہے۔

سوال۔ اہلِ حق کے نزدیک مرد کی کیا تعریف ہے۔

جواب۔ درد سے مرد بنتا ہے۔ درد نہ ہو تو مرد نہیں۔

سوال۔ منصب کسے عطا ہوتا ہے۔

جواب۔ استاد وہی بنتا ہے جو استاد کے پاس جاتا ہے۔

سوال۔ سلامتی میں کیسے رہا جاسکتا ہے۔

جواب۔ سلامتی تنہائی میں ہے ؎

بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت بر کنار است

سوال۔ قرآن پاک† سات حروف پر اتارا گیا ہے اس کا کیا مطلب ہے۔

جواب۔ قرآنِ پاک کے لئے حدیثِ پاک کا سات حروف کی طرف اشارہ شرعِ مدام‡ ہے۔ شرعِ مدام کے یہ معنی ہیں کہ شریعت (حکم) کو اپنے مطابق نہ بناؤ بلکہ خود اس کے مطابق ہو جاؤ۔

سوال۔ معصیت سے بچنے کی صورت کیا ہے۔

جواب۔ معصیت سے بچنے کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ انسان بزرگانِ دین کے ساتھ وابستہ ہو جائے اور ان کے قدم بقدم چلے۔

سوال۔ جب جنتی اور دوزخی ہونے کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے تو پھر عمل پر کیوں زور دیا گیا ہے۔

جواب۔ اس سوال کا تعلق محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیثِ مبارکہ

---

† انزل القرآن علی سبعۃ احرف۔ الحدیث

‡ شرعِ مدام کے فقرہ میں بذاتِ خود سات حروف ہیں۔ (صمدانی)

سے ہے جس میں آپ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرکے فرمایا تھا۔ کہ میرے ہاتھ میں یہ دو کتابیں ہیں۔ اور ان میں جنتیوں اور دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اس پر صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ اگر اس معاملہ سے فراغت ہو چکی ہے تو پھر عمل کی کیا ضرورت باقی رہی۔ یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا۔ "سیدھے رہو اور قربِ الٰہی حاصل کرو کیونکہ جنتی کا خاتمہ جنتیوں کے عمل پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ پہلے کوئی بھی عمل کرے اور یقیناً دوزخی کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ پہلے کوئی بھی عمل کرے۔"

اس حدیثِ پاک کی تشریح اعلیٰ حضرت تقدس مآب سلطان الحقیقت یوں فرماتے ہیں ــــ

متذکرہ کتابوں کے دو عنوان تھے۔ داہنے ہاتھ والی کتاب کا عنوان تھا "ماننے والے" یعنی جن کا رخ محبوب صلعم کا رخ ہوگا وہ سب جنتی ہوں گے اور بائیں ہاتھ والی کتاب کا عنوان تھا "نہ ماننے والے" جو سب دوزخی ہوں گے۔ بالفاظِ دیگر جو محبوب صلعم کی طرف کو اختیار نہیں کریں گے۔ وہ سب دوزخی ہوں گے چاہے عمل کی کوئی صورت ہو ان کا رُخ غیر کا رُخ ہوگا۔ ابلیس کا واقعہ اس کا شاہد ہے۔ آپ نے مزید تشریح فرماتے ہوئے فرمایا۔ "اعمال کو فضیلت نہیں ہے رخ کو فضیلت ہے"

سوال۔ فاسق کی تعریف کیا ہے۔

جواب۔ ترکِ عادت کا نام اعمال ہے۔ اگر ترکِ† عادت ہے تو عاشق ہے۔

---

† العبادۃ ترکُ العادۃ۔ الحدیث۔ عبادت ترکِ عادت کا نام ہے۔

اور اگر ترکِ عادت نہیں تو فاسق ہے ۔

سوال ۔ قرآن شریف اور حدیث شریف میں فرق کیا ہے ۔

جواب ۔ محبوب صلعم پر جو علمِ الٰہی اترا ہے وہ قرآنِ پاک ہے اور جو اس پر عمل فرمایا ہے ۔ وہ حدیثِ † پاک ہے حدیثِ طیبّ ہے اور قرآن پاک ہے ۔ حدیث اعمال ہے اور قرآن قول (حکم) ہے

سوال ۔ نفس کی تعریف کیا ہے ۔

جواب ۔ دین سے بے خبری اور دنیا سے خبرداری ۔

سوال ۔ بزرگانِ دین کے نزدیک کیا نفس کُشی جائز ہے ۔

جواب ۔ سالک کے لئے اللہ تعالیٰ نے نفس ایک ایسا مقام رکھا ہے ۔ جس سے اس کے مراتب کی تکمیل ہوتی ہے اگر انسان کے وجود کے اندر نفس کا مقام نہ رکھا جاتا تو سب بلندی درجات ختم ہو جاتی ۔ اللہ تعالےٰ نے فرشتہ میں یہ مقام نہیں رکھا ۔ اس لئے وہ ان درجات کا حامل نہیں ہے ۔ جن کا انسان ہے ۔ جہاں فرشتہ کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے انسان کی ابتداء ہوتی ہے اور اس کے درجات شروع ہوتے ہیں ۔ لہٰذا نفس کُشی انسان کے لئے مراتب کے لحاظ سے خودکُشی کے مترادف ہے ۔ البتہ تربیتِ نفس نہایت ضروری ہے ۔

سوال ۔ حقیقت کی رُو سے اہلِ خیر اور سائل کا مقام کیا ہے ۔

---

† ۔ یہاں حدیث شریف سے مراد سنت ہے ۔

جواب ۔ اہلِ خیر کے دو مقام ہیں ۔ جسے وہ دیتے ہیں اور جو بھی دیتے ہیں لینے کی نیت سے نہیں دیتے ۔ دوسرے دینے کی خواہش رکھتے ہیں اور دینے کا مقام بھی رکھتے ہیں ۔ اسی طرح سائل کے بھی دو مقام ہیں ۔ پہلا سائل لیتا ہے اور اپنے ہی لئے لیتا ہے دیتا کسی کو نہیں ۔ اگر وہ لیکر کسی کو دے تو خود داتا بن جاتا ہے لہٰذا اس صورت میں داتا جب بنتا ہے منگتے ہی سے بنتا ہے ۔ بالفاظِ دیگر داتا اللہ تعالیٰ کا منگتا ہوتا ہے ۔ جو اسے عطا ہوتا ہے اللہ تعالےٰ کی مخلوق کو دے دیتا ہے ۔ اور اس سے واپسی کی اُمید نہیں رکھتا ۔

دوسرا مقام سائل کا یہ ہے کہ جو وہ لیتا ہے کسی کو دیتا نہیں ۔ ایسا سائل (منگتا) ہمیشہ منگتا ہی رہتا ہے اسے داتا بننے کی کبھی توفیق نہیں ملتی ۔

سوال ۔ مومن کس شان کا حامل ہے ۔ اور حسنِ ایمان کیا ہے ۔

جواب ۔ مخلوق خانۂ اعمال ہے ۔ اللہ تعالےٰ کی مخلوق سے اللہ تعالیٰ کے ہو کر رہنا یہ مومن کی شان ہے اور اللہ تعالےٰ کی مخلوق سے حسنِ سلوک کرنا یہ حسنِ ایمان ہے ۔

سوال ۔ اللہ کے بندے کی تعریف کیا ہے ۔

جواب ۔ اللہ کا بندہ ماسوائے اللہ کے کچھ نہیں چاہتا ۔ اس کا لینا اور دینا اللہ تعالےٰ سے ہوگا ۔ اور اُس کا چلنا پھرنا ۔ کھانا پینا ۔ سونا جاگنا اور اٹھنا بیٹھنا سب محبوب صلعم کے نقشِ قدم کے مطابق

ہوگا۔

سوال۔ فضیلت کس چیز میں ہے۔

جواب۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ عمل کو فضیلت ہوتی ہے۔ فضیلت رُخ کو ہے۔ +

اسی طرح یہ بھی درست نہیں ہے کہ فضیلت حکم کو جاننے میں ہے۔ فضیلت حکم کے ماننے میں ہے۔

سوال۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ کیوں اور کس طرح ادا کیا جائے۔

جواب۔ نعمت کا شکریہ ادا ہو تو نعمت کی برکت برقرار رہتی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف واپس چلی جاتی ہے۔ اور انسان کے ہاتھ میں صرف بات چیت ہی رہ جاتی ہے۔ جیسے ثمرِ نعمت کے چھلکے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اور چھلکا سوائے جلانے کے اور کسی کام نہیں آتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ نہ تو اپنی بات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور نہ کوئی دوسرا ہی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔

واضح رہے قول کا شکریہ قول سے۔ اعمال کا شکریہ اعمال سے۔ علم کا شکریہ علم سے اور اخلاص کا شکریہ اخلاص سے ادا کیا جاتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے۔

+ اس سے مراد محبوب کا رُخ ہے۔

- قول سے شکریہ ______

اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کیا جائے۔

- اعمال سے شکریہ ______

جو اللہ تعالیٰ نے نعمت عطا کی ہے اس کے راستے میں اسے صرف کیا جائے۔

- علم سے شکریہ ______

جو علم عطا ہوا ہو اسے مخلوق تک پہنچایا جائے۔

- اخلاص سے شکریہ ______

خود مخلص رہ کر مخلوقِ خدا کے ساتھ اخلاص برتا جائے۔

سوال۔ بندگی کی شرط کیا ہے۔

جواب۔ بندگی کی شرط یہ ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہے گا۔ تو بندگی یعنی عبادت ہے ورنہ نیک عادت ہے۔

سوال۔ اعمال کی شرح کیا ہے۔

جواب۔ اس کے لئے جان لینا چاہیئے۔ کہ ہاتھ کو پاک (امین) رکھا جائے۔ اس سے نیت درست ہو جاتی ہے۔ جب نیت درست ہو جاتی ہے۔ تو عقیدہ درست ہو جاتا ہے۔ اور جب عقیدہ

درست ہو جاتا ہے تو اعمال درست ہو جاتے ہیں۔

حقیقتاً نیت مومن کی زمین ہے۔ جب زمین اچھی ہوتی ہے تو اس میں پھل پھول بھی اچھے لگتے ہیں۔ بنجر زمین میں خواہ کتنا ہی اچھا بیج ڈالا جائے اس میں روئیدگی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ مسلمان کا ہاتھ امین اور زبان برائی سے پاک ہونی چاہیئے۔

سوال۔ محبت میں ادب کا کیا مقام ہے۔ اور توفیق کی صورت میں تقسیم کس طرح کی جاتی ہے۔

جواب۔ محبت ادب کا کل ہے۔ اور علم تقسیم کی جان ہے۔

واضح رہے محبت وہ ہے جو حق کے ساتھ تعلق رکھتی ہو اور علم وہ ہے جو حقیقت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔ اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ حقیقت بزرگانِ دین ہی کے پاس ہوتی ہے۔ کتاب اور شنید سے اس تک پہنچنا نہایت دشوار ہے۔ مزید وضاحت کے لئے جان لینا چاہیئے کہ علم حسن ہے اور محبت حسین ہے۔ بزرگانِ دین کے نزدیک نیک گمان رکھنا حسن اور نیت نیک رکھنا حسین ہے۔

سوال۔ نور کی تقسیم کیا ہے۔

جواب۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے جو نور اتر رہا ہے وہ بارانِ رحمت کی شکل میں سب کے لئے ایک ہی اتر رہا ہے۔ اور اس کی

تقسیم نیت پر ہو رہی ہے۔ وہی ایک نور مسلمان کو مسلمان ہونے کی برتری عطا کرتا ہے۔ اور وہی مومن کو مومن ہونے کی بلندی بخشتا ہے۔ اسی نور سے اولیاء اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتے ہیں۔ اور اسی سے کافر اور منافق اپنی خیانت کی انتہا کو پاتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ الاعمال بالنیات۔

سوال۔ اللہ تعالےٰ سے پاک رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔

جواب۔ اللہ تعالےٰ سے پاک رہنا اللہ تعالےٰ کی مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ہو کر رہنے کے معنی نکلتے ہیں۔

سوال۔ اہلِ حق کے نزدیک سچے کی پہچان کیا ہے۔

جواب۔ جو شخص سچا ہو جاتا ہے اس کی خلوت اور جلوت ایک ہو جاتی ہے۔ وہ اس لئے کہ ایسا شخص صاحبِ حقیقت ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت حق سے ہے اور حق حق والوں سے۔

سوال۔ موت اور حیات میں کیا فرق ہے۔

جواب۔ حیات کا تعلق نورت ہے۔ اسی لئے اہلِ حق کے نزدیک موت کو موت ہے حیات کو موت نہیں ہے۔ حیات کل ہے اور موت اس کا جزو ہے۔ اللہ والے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لئے موت ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ موت ان کے لئے وصال کا دروازہ ہے۔ ویسے وہ حیات رہتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا وہ ان کی بھلائی چاہتا ہے اسی طرح اللہ والے اللہ تعالیٰ کی پیاری مخلوق سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے۔

وہ اس کی بھلائی میں لگے رہتے ہیں۔ لہٰذا وہ سنت اللہ پر چل کر بقائے دوام حاصل کر لیتے ہیں۔

سوال۔ عام لوگوں اور اہلِ حق میں کیا فرق ہے۔

جواب۔ عام لوگ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور حرص و ہوا کے متوالے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں فانی ہیں۔ اس لئے فنا ان کے لئے مقدر ہو جاتی ہے۔ اللہ والے حسبِ ضرورت دنیا کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے لگے لگے رہتے ہیں جو باقی ہے اس لئے فنا ان پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ باقی ہو جاتے ہیں۔ اور باقی باللہ ہو جاتے ہیں۔

سوال۔ بزرگانِ دین کی نظر میں عقیدہ کیا ہے۔

جواب۔ اہلِ طریقت کے نزدیک عقیدہ ایک مقام کا نام ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیاروں کو عطا کیا ہوا ہے۔ جو ان سے پیار کرتا ہے۔ اسے عقیدہ بھی عطا ہو جاتا ہے اور مقام بھی۔

عقیدہ کتاب اور شنید سے تعلق نہیں رکھتا۔ اگر عقیدہ کا تعلق اس سے ہوتا تو ساری کائنات کا ایک ہی عقیدہ ہوتا۔

اہلِ حقیقت کے نزدیک عقیدہ کے معنے محبت کے نکلتے ہیں۔ اور محبت کا تعلق عمل سے ہوتا ہے۔ قول سے نہیں ہوتا۔ جو لوگ قول کو عقیدہ سمجھتے ہیں۔ وہ اہلِ حقیقت کے نزدیک حقیقت سے بہت دور رہتے ہیں۔ اس لئے ارشادِ باری ہوتا ہے۔ " اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ "۔ ظاہر ہے۔ کہ اطاعت عمل سے ہوتی ہے۔ محض زبانی اقرار سے نہیں۔

سوال۔ فرشتے اور انسان میں کیا فرق ہے۔

جواب۔ فرشتہ کا کُل عبادت ہے اور انسان کا جزو عبادت ہے۔ پھر انسان کی ابتدا عبادت ہے اور فرشتہ کی انتہا عبادت ہے۔ اسی طرح انسان کا مستقبل عبادت ہے اور فرشتہ کا عمل (حال) عبادت ہے۔ لہٰذا انسان فرشتہ سے افضل ہے۔

سوال۔ بزرگانِ دین بُرے کو بُرا کیوں نہیں کہنے دیتے۔

جواب۔ وہ اس لئے کہ کوئی شے وضعی طور پر بُری نہیں ہوتی۔ کسی مقام پر وہ بُری ہوتی ہے اور کسی پر اچھی۔ اچھے مقام پر پہنچ کر ہر شے اچھی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ اگر کسی شے کو بُرا کہو گے تو معنوی اعتبار سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہو گا۔ جو ہر شے کا خالق ہے۔ البتہ کسی ضرر رساں شے کا جس کا استعمال اس کے عمل کے مطابق نہ ہو عادی ہو جانا بُرا ہے۔

سوال۔ کرم کیا چاہتا ہے عمل یا احترام۔

جواب۔ کرم کے نزدیک وہی عمل قابلِ قبول ہے جس میں احترام (خلوص) کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

سوال۔ اہلِ حق کے نزدیک طمع کیا ہے۔

جواب۔ مومن کوئی کام کرے اسے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس عمل سے دوری پیدا ہوتی ہے۔ یا حضوری۔ اگر دوری پیدا ہو تو یہ طمع ہو گی اور اگر اس کے برعکس حضوری پیدا ہو تو اس کے معنی منظوری کا (اخلاص) کے نکلیں گے۔ چاہے عمل کی کوئی صورت ہی کیوں نہ ہو۔

واضح رہے کہ اگر دوری ہو گی تو نفس مترجم ہو گا۔ اور اگر حضوری ہو گی تو

قرآنِ حکیم شاہد ہوگا۔

سوال۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام کیا ہے۔

جواب۔ حدیثِ قدسی ہے، "جسے میں سب سے بڑا انعام عطا کرتا ہوں اُسے اپنے علم کی سمجھ عطا کر دیتا ہوں۔ یعنی اسے علم بھی عطا ہوتا ہے، اور اسے سمجھنے کی توفیق بھی۔

سوال۔ کیا بزرگانِ دین کا خیالی تصوّر باندھنا چاہیئے۔

جواب۔ جو لوگ بزرگانِ دین کا خیالی تصوّر باندھتے ہیں۔ ان کا عمل ناقص ہوتا ہے۔ بزرگانِ دین کے وجود کو اللہ تعالیٰ نے عمل کی صورت سے اتارا ہے۔ لہذا بزرگانِ دین کے دل کو اللہ تعالیٰ کا علم جاننا چاہیئے تصوّر کوئی عملی صورت نہیں ہے۔ اور نہ اُسے علم کا مقام حاصل ہے۔ جس فعل کو شریعت، طریقت، اور حقیقت کی رُو سے علم و عمل کا درجہ حاصل نہ ہو وہ کارِ عبث ہوتا ہے۔ اور سالک کے لئے کسی کارِ عبث کا کرنا قطعاً منع ہے۔

سوال۔ بزرگانِ دین کی طرف کیا ہے۔

جواب۔
- بزرگانِ دین کے قول کو تسلیم کیا جائے تو یہ تصوّر ہے قول سے۔
- بزرگانِ دین کے وجود کو اعمال کا مرکز تسلیم کیا جائے تو یہ تصوّر ہے اعمال سے
- بزرگانِ دین کے دل کو اللہ تعالیٰ کے علم کا محور تسلیم کیا جائے تو یہ تصوّر ہے علم سے۔

- بزرگانِ دین کے اخلاص کو سرچشمۂ فیض تسلیم کیا جائے تو یہ تصوّر ہے مولا سے

واضح رہے کہ جس صاحب کے یہ چاروں مقام پورے ہو جاتے ہیں ان کی ایک طرف بن جاتی ہے۔ اور یہی طرف معنوی حیثیت سے بزرگانِ دین کی طرف ہے۔ اور بزرگانِ دین کی طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب صلعم کی طرف ہے۔

لہذا قرآنِ پاک کو جاننا ہو تو بزرگانِ دین کو جانو۔ اگر بزرگانِ دین کو نہ جانا جائیگا۔ تو قرآنِ پاک کا جاننا محض انسانی ناقصِ علم سے ہوگا۔ اس کی وضاحت کے لئے یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ انسان حادث ہے اور قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور قدیم ہے۔ اس اصول کے تحت انسان کا قرآنِ حکیم کو اپنے ذاتی علم سے جاننا حادث علم سے ہوگا قدیم سے نہیں ہوگا۔ قدیم علم بزرگانِ دین کے قدم ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ بزرگانِ دین خدا کے رسولؐ کے نقشِ قدم پر گامزن ہوتے ہیں۔ اور خدا کے رسول کا قدم سوائے خدا کے اور کسی طرف نہیں بڑھتا۔ پس بزرگانِ دین کو جاننا قرآن پاک کو جاننا ہے۔ ان کے قول کو سننا قرآن پاک کو سننا ہے۔ لہذا اس مقام پر کسی صاحبِ حال بزرگ نے کہا ہے۔ ع

معنیٔ قرآں ہم ہیں قرآں بیاں ہمارا

سوال۔ مصائب و آلام کا انسانی زندگی میں کیا مقام ہے۔

جواب۔ یہ جان لینا چاہیئے کہ اگر مصائب و آلام ختم ہو جائیں تو انعامات و درجات بھی سب ختم ہو جائیں۔ چنانچہ کہا گیا ہے ؎

بڑھے جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
نہ ہوں جو مشکلیں تو زندگی دشوار ہو جائے

سوال۔ کیا اہلِ تصوف اور اہلِ حق میں کوئی فرق ہے۔

جواب۔ ہاں ہے۔ اہلِ تصوف اللہ تعالیٰ کے ساتھ کتاب وشنید سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات دیگر مذاہب والوں میں بھی ہوتی ہے۔ ان کے راہب کتاب وشنید (جو نتیجہ ہے مفروضوں کا) اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ راہِ حق کو پُرخار اور الجھا ہُوا بنا دیتا ہے۔ لہذا۔ ع

بندۂ تخمین وظن کرمِ کتابی تو نہ بن

دینِ حق کا سلجھا ہوا راستہ وہی ہے جس کی طرف خود حق نے رہنمائی کی ہو۔ اور یہ ہوتی ہے انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعہ۔ لہذا اہلِ حق دینِ حق کو اپنی اساس بناتے ہیں۔ وہ اللہ کے محبوب کے ساتھ پانچ وقت۔ سات وقت اور ہر وقت باوضو رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان کی زبان برائیوں سے پاک اور ہاتھ امین رہتا ہے۔ مزید براں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پاک بھی رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ خلقِ خدا سے بے غرض و غائت رہنا اللہ تعالیٰ سے پاک رہنا ہے۔

چونکہ اہلِ حق حقیقت آشنا ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ باحقیقت کہلاتے ہیں۔ واضح رہے کہ باحقیقت زندہ اور بے حقیقت مردہ ہوتا ہے جو شخص کتاب وشنید میں الجھا رہے گا۔ وہ بے حقیقت رہے گا۔ اور جو حق والوں سے لگ جائیگا۔ اسے حق عطا ہو جائے گا۔ اور کتاب وشنید اس کی شاہد ہو جائے گی۔ اس مقام پر سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں ؎

قلب جے ہلیا تاں کی ہویا کی ہویا ذکر زبانی ہو
روحی، قلبی، خفی، سِرّی سبھے راہ حیرانی ہو

ترجمہ۔ اگر قلب جاری بھی ہو جائے تو یہ محض زبانی ذکر سے ہو گا۔ روحی، قلبی خفی، سِرّی یہ سب تصوف کی اصطلاحیں راہِ حق میں حیرانی و پریشانی پیدا کرتی ہیں یعنی ان سے حقیقت کی راہیں استوار نہیں ہوتیں۔ اور حقیقت کیا ہے؟ وہ پاکی ہے۔

سوال۔ تقدیر کے متعلق بزرگانِ دین کیا فرماتے ہیں۔

جواب۔ تقدیر سبب کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ جو اسباب سے گزر جاتا ہے تقدیر اس کے تابع ہو جاتی ہے۔ انسان کا اپنا سبب ذاتی تقدیر کا بلاوا ہے۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں۔ شرک سے پاک ہونے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ سبب سے دور رہا جائے اور تعین[+] سے پاک۔

[+] تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت اسکی تشریح یوں فرماتے ہیں۔ کہ رضائے الٰہی سے دُور رہ کر اپنی کوشش کو محدود کرنیکا نام اہلِ حق کے نزدیک تعین ہے اور اس کا نتیجہ نکلتا ہے۔ خشیت جو انسان کیلئے حیرانی و پریشانی پیدا کرتا ہے

لیکن اس مقام پر واضح رہے کہ جس سبب کو اہلِ حق روکتے ہیں۔ وہ سبب دنیاوی اسباب ہیں سے ہے۔ اگر سبب کا نتیجہ رب ہو تو وہ سبب کامل ہے۔ اور اس کا تعلق لطافت سے ہے۔ جس طرح اسباب کا قبول کرنا گمراہی ہے اسی طرح سببِ کامل کا قبول نہ کرنا گمراہی ہے۔ جو سببِ کامل کو قبول کر لیتے ہیں۔ خدا اُن کا ہر مقام پر ساتھ دینے لگ جاتا ہے اور وہ تقدیر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تقدیر دنیا کے اسباب ڈھونڈنے والوں ہی پر حاوی رہتی ہے، اہلِ حق پر نہیں۔

سوال۔ ستاروں کا تقدیر سے کیا تعلق ہے۔

جواب۔ جس ستارے کو انسان مان لے گا۔ وہ ستارہ اس پر غالب آجائے گا۔ وہ اس لئے کہ اس نے ماسوا کو مان لیا۔ اور اس کے علی الرغم جو صاحب اللہ تعالیٰ کو جان لیں گے۔ وہ ستارہ ان کے تابع ہو جائیگا۔

سوال۔ کیا بزرگانِ دین کے لئے علمِ کتابی ضروری ہے۔

جواب۔ بزرگانِ دین کتاب و شنید سے نہیں۔ کتاب و شنید ان سے ہے۔ عام آدمی شنید کے ساتھ ہے۔ خاص کتاب کے ساتھ اور خاص الخاص اُمّ الکتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

سوال۔ دنیا کے کیا معنیٰ ہیں۔

جواب۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ دنیا کے معنی خلق اللہ ہیں۔ بزرگانِ دین کے نزدیک دنیا کے معنی غرض و غایت کے نکلتے ہیں۔ اگر خلق اللہ سے غرض و غایت سے پیش آیا جائے۔ تو یہ دنیا ہے اور اگر غرض و غایت اُٹھ جائے تو عین دین ہے

انسان کے پیشِ نظر اگر غرض و غائیت ہو تو وہ بے حقیقت ہے۔ اور اگر اس کی نیت غرض و غائیت سے پاک ہو تو با حقیقت ہے۔ اس مقام پر حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ع

ایہہ پاکی بن پاک ماہی دے پاکی جان پلیدی ہُو

واضح رہے کہ کوئی انسان غرض و غائیت سے پاک نہیں ہو سکتا جب تک کوئی پاک کرنے والا نہ مل جائے۔ حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ دنیا کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

سوال۔ جب محبّ کو علم عطا ہو جاتا ہے۔ تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

جواب۔ جب محبّ کو علم عطا ہو جاتا ہے تو پہلے وہ خود چین سے رہتا ہے اور پھر اس سے مخلوقِ خدا چین سے رہتی ہے۔

سوال۔ کیا انسان کو اسباب کی عدم موجودگی میں بھی اللہ تعالےٰ نے اس کے کام کے لئے مکلّف کیا ہے۔

جواب۔ ہر واقفِ حال کو چاہیئے کہ وہ جہاں بھی رہے اور جس حال میں بھی رہے خدائی ڈیوٹی انجام دیتا رہے۔ وہ اس لئے کہ کمی بیشی کا ذمہ اللہ تعالےٰ نے خود لے رکھا ہے۔ اسباب پیدا کرنا اس کا اپنا کام ہے انسان کا نہیں۔

جب انسان خود اسباب کی فکر میں لگ جاتا ہے تو وہ شرک کا

مرتکب ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

فرزند بندہ الیست خدا را تو غم مخور
تو کیستی کہ بہ ز خدا بندہ پروری

سوال۔ بزرگانِ دین سے کیا طلب کیا جائے۔

جواب۔ جب کسی بزرگ کے پاس جاؤ (خواہ وہ عالم دین ہو یا عارف) تو اُس سے ایسی بات مت پوچھو کہ پڑھی یا سُنی جا سکتی ہو۔ اگر اس سے عام بات پوچھو گے تو حقیقی فیض سے محروم رہ جاؤ گے۔ اس سے وہ بات پوچھنی چاہیے جو دنیا و آخرت میں کام آ سکے۔ اور وہ صرف یہ بات ہو سکتی ہے کہ اس سے کہو کہ اگر غرض و غائیت سے وہ پاک ہے تو تمہیں بھی اس سے پاک کر دے کیونکہ دین کی بنیاد پاکی سے ہے۔ اور اس کے بغیر دین کو سمجھنے کے لئے شرح صدر ممکن ہی نہیں ہے۔

سوال۔ کیا گروہ بندی کسی حیثیت سے بھی اہلِ حق کے لئے مفید مطلب ہو سکتی ہے۔

جواب۔ گروہ بندی ہمیشہ غرض و غائیت کے تحت ہوتی ہے اور اہلِ حق غرض و غائیت سے پاک رہتے ہیں۔ لہٰذا انہیں کسی مقام پر بھی گروہ بندی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا گروہ وہی ہے جس کے سربراہ خدا کے محبوبؐ ہیں۔ اور ان کی آخری منزل حق ——— صرف حق ہے۔ واضح رہے، حقیقت اسلام ہے۔ اور اسلام ہی سے سلامتی ہے۔

سوال۔ کیا طلب ایک حجاب ہے۔

جواب۔ ہاں، طلب بھی ایک حجاب ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جو طالب اور مطلوب کے درمیان ایک دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ اگر درمیان سے طلب اُٹھ جائے تو طالب مطلوب بن جاتا ہے، اور مطلوب طالب اس طرح "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

سوال۔ خودی، تکبّر، مان اور گمان انسان سے کس طرح ختم ہو سکتے ہیں۔

جواب۔ عشق+۔ صرف عشق سے۔ جس گھر میں عشق کے مبارک قدم آ جاتے ہیں وہاں سے خودی، تکبّر، مان اور گمان خود بخود رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں چلے جاتے ہیں۔ جہاں ان کا مقام ہوتا ہے یعنی مقامِ غرض و غایت پر۔ چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

اور پھر فرماتے ہیں ؎

عقل آمد دین و دنیا شد خراب
عشق آمد ہر دو عالم کامیاب

سوال۔ توبہ کا کیا مقام ہے۔

جواب۔ توبہ کرنے کے بعد عمل کی شرط شروع ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے توبہ پاکیزگی کا نام ہے۔ مثال کے طور پر کنوئیں میں اگر کوئی نجس چیز گر جائے

+ اہلِ حق کے نزدیک عشق پاکی کو کہا جاتا ہے۔

تو اس کی موجودگی میں کنوئیں کو پاک کرنے کیلئے چاہے کتنی ہی شرطیں پوری کر دی جائیں کنواں پاک نہیں ہوتا۔ جب تک نجس شئے جو اس میں گری ہوئی ہے نکال نہ دی جائے۔

سوال۔ مقامِ دوام کیا ہے۔

جواب۔ پسندیدہ اور ناپسندیدہ دونوں مقامات پر اللہ تعالٰے کے ساتھ راضی برضا رہنا یہ مقام دوام ہے۔

سوال۔ کیا طمع کی موجودگی میں اہلِ حق کا ساتھ دیا جا سکتا ہے۔

جواب۔ طمع کے تین حرف ہیں اور تینوں خالی یعنی ان میں سے کوئی بھی نقطہ کا حامل نہیں ہے۔ اس لئے یہ خیر نہیں غیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھرے خزانہ میں سے ان کے ذریعہ کچھ نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان میں اللہ تعالٰے نے حاصل کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ اس بارہ میں کسی نے یہ نہایت درست کہا۔ ع

طمع را سہ حرف ست ہر سہ تہی

سوال۔ زندہ رہنے کیلئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

جواب۔ صحیح رُخ پر رہ کر اللہ تعالٰے کا فضل تلاش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ "وابتغو من فضل اللّٰہ" ـــ (جمعہ)

اللہ تعالٰے کا فضل تلاش کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشقت نہیں تلاش کرنی چاہیئے اہلِ حق کے نزدیک زندگی اللہ تعالٰے کی رحمت ہے۔ زحمت نہیں جو لوگ مشقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ غیر شعوری طور پر زحمت کو دعوت

دیتے ہیں۔ ان کی دنیا تو خراب ہوتی ہی ہے۔ صحیح رُخ پر قائم نہ رہ سکنے کے سبب عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ صحیح رُخ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کر کے اس کی خوشنودی میں لگے رہنا چاہیئے (یعنی حال پر جو وہ عطا فرمانا چاہتا ہے وہ لے لینا چاہیئے اور جو نہیں دینا چاہتا اس کی ہرگز خواہش نہیں کرنی چاہیئے)

لیکن بے یقینی جو عقل کی پیداوار ہوتی ہے وہ یہ سکھاتی ہے کہ اللہ کی خوشنودی کو چھوڑ کر جسم (جو فانی ہے) کی بقا کیلئے جد و جہد میں مصروف رہا جائے۔ ظاہر ہے کہ جو جد و جہد فانی کے لئے ہو گی۔ وہ فانی ہو گی اور جو باقی کے لئے ہو گی وہ باقی ہو گی۔ چونکہ باقی (اللہ تع) کے لئے جد و جہد نہیں کی جاتی اس لئے فانی (جسم) کیلئے جو کاوش کی جاتی ہے وہ فنا ہو جاتی ہے۔ اور عاقبت میں کوئی حصّہ باقی نہیں رہتا۔

سوال۔ سُود لینا یا دینا کیوں منع ہے۔

جواب۔ ہر وہ کاروبار جس میں منافع ہی منافع کا پہلو ہو اور نقصان کا کوئی احتمال نہ ہو بزرگانِ دین کے نزدیک منع ہے۔ وہ اس لئے کہ اس سے توکل کا وہ پہلو ختم ہو جاتا ہے جو جائز کاروباروں مثلاً زراعت، تجارت اور صنعت وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی کاروبار میں توکل کا پہلو بالکل ختم ہو جائے اور خدا پر بھروسہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ تو اس سے حضوری ختم ہو جاتی ہے۔ اور دُوری پیدا ہو جاتی ہے۔ جو منشائے ایزدی کے خلاف ہے۔

لہذا سود کی اجازت نہ شریعت سے ہے، نہ طریقت سے اور نہ حقیقت ہی سے ہے۔

سوال۔ حق و باطل میں امتیاز کی مکمل وضاحت فرمائی جائے۔ یہ کیسے ہوتا ہے۔

جواب۔ ماسوا اللہ کے ہر شے باطل ہے۔ لہذا قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ تمہارے ماں باپ۔ بیوی بچے۔ کاروبار وغیرہ اگر تمہیں راہِ حق میں آگے بڑھنے سے روکتے ہیں، تو قہر و عذابِ الہٰی آئے اور ان سب کو ختم کر دے یعنی اس لحاظ سے دنیا کے تمام مقدس رشتے بھی ماسوا اللہ میں داخل ہیں حتیٰ کہ اپنا وجود بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے جو ماسوا اللہ سے پاک رہے وہ راہِ راست پر ہے اور حق اس کے ساتھ ہے چنانچہ لبید جس کا احترام حضورؐ خود فرماتے تھے وہ کہتا ہے۔ ع

الا کلّ شیئٍ ما خلا اللہ باطل

(خبردار! خدا کے سوا ہر شے باطل ہے)

سوال۔ راہِ حقیقت میں نیستی کیا ہے۔

جواب۔ مومن کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو بے چون و چرا تسلیم کرے۔ خواہ وہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ نیستی اس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے سامنے نیست ہو جائے۔

سوال۔ بے حقیقت کون ہوتا ہے۔

جواب۔ جس کو حالات بدل دیتے ہیں۔

سوال۔ با حقیقت کون ہوتا ہے۔

جواب۔ جو (اللہ تعالیٰ کی رضا پر قائم رہ کر) حالات کو بدل دیتا ہے۔

سوال۔ اگر طبیعت عبادت کی طرف مائل نہ ہو تو کیا کیا جائے۔

جواب۔ جو لوگ عبادت کی طرف مائل ہوں ان سے گھل مل جانا چاہئے۔

سوال۔ اوراد و وظائف ضروری ہیں یا نیت کی صفائی، حقیقت تک پہنچنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

جواب۔ طریقت کی رُو سے نیت کی صفائی سب سے پہلے ضروری ہے۔ کیونکہ دین کی بنیاد پاکی سے ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے، کہ نیت ہر ایک انسان کی حقیقت ہے۔ جس کی حقیقت بگڑ جاتی ہے، اس کا دین بھی بگڑ جاتا ہے۔ اور دنیا بھی۔

سوال۔ نفسِ امّارہ، نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنہ کن محرکات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

جواب۔ نفسِ امّارہ۔ کسی کی بات نہ ماننا اپنی منواتے جانا نفسِ امّارہ کے محرکات میں سے ہے۔ اس کا حامل دین اور دنیا دونوں سے غافل ہوتا ہے۔

نفسِ لوّامہ۔ شریعت کے اصولوں پر کاربند رہنے سے اس کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس کا حامل شرعی اوامر و نواہی کا پابند اور جائز و ناجائز میں امتیاز کرنے والا ہوتا ہے۔ حقیقتاً وہ آدمی پاک ہو جاتا ہے۔ اور اس سے تمام بُری عادتیں دور ہو جاتی ہیں۔

نفسِ مطمئنہ۔ اللہ تعالےٰ سے پاک رہنا اس کے محرکات میں سے ہے۔ اللہ تعالےٰ چونکہ پاک ہے اس لئے اس سے پاک رہنے سے نفسِ مطمئنہ حاصل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ سے پاک ہونا اس کا مخلوق سے بے غرض و غایت ہونا ہے۔

سوال۔ کیا مادی تقاضوں کو نظر انداز کر کے دین کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔

جواب۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے محبوبؐ کو دین بھی مکمل عطا فرمایا اور دنیا بھی مگر مکمل دنیا دین کے بعد ہی عطا فرمائی۔ اس قاعدہ سے دین سے پہلے جو دنیا عطا ہوتی ہے وہ نامکمل ہوتی ہے۔ لہذا ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اسی لئے اس مقام پر بزرگانِ دین نے فرمایا ہے۔ کہ ساری کائنات کی بنیاد اللہ تعالےٰ سے ہے۔ اور دین کی اساس بزرگانِ دین سے ہے۔ لہذا جو دین کی کنہہ کو پانا چاہتا ہے وہ بزرگانِ دین تک پہنچے۔ وہ اسے محبوبؐ تک پہنچا دیں گے۔ اور محبوبؐ اس کا ہاتھ خدا کے ہاتھ میں تھما دیں گے کتاب و شنید سے راستہ سے بھٹکنے کا امکان رہتا ہے۔ لہذا ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن
رُوئے خود را جانبِ دلدار کن

اور صحیح بات تو یہ ہے کہ کتاب و شنید سے بھی صرف اسی صورت میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جب بزرگانِ دین سے رجوع کیا جائے۔ وہ اس لئے کہ کتاب و شنید کا درجہ قول کا ہے اور قول اس وقت تک معتبر نہیں ہو سکتا۔ جب تک عمل اس کی تصدیق نہ کر دے۔ عمل سے تصدیق ہو جانے کے بعد علم عطا ہوتا ہے۔ اور حق کی طرف سے علم کا انعام ہوتا ہے اخلاص یہ تمام درجات

صرف بزرگانِ دین کی رہنمائی ہی میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور کسی طرح نہیں۔

جب بزرگانِ دین کی دعا و برکت اور رہنمائی سے علم و اخلاص عطا ہو جاتا ہے تو پھر جو دنیا عطا ہوتی ہے وہ شر و فساد سے پاک اور سراپا رحمت ہوتی ہے۔ ایسی ہی دنیا کو دین کامل کا نام عطا کیا جاتا ہے۔ وہ اس لئے کہ اس طرح عطا ہوئی ہوئی دنیا پر وہ رنگِ شہودی چڑھا ہوا ہوتا ہے جو پاکانِ ہستی کا گوہرِ مقصود ہوتا ہے۔ ایسی دنیا کو کسی طرح بھی دنیائے دوں نہیں کہا جا سکتا۔ اس مقام پر مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

لہذا بزرگانِ دین کی طرف سے دعوتِ عام ہے کہ آؤ رحمتوں کے خزانے لٹ رہے ہیں۔ جی بھر کے لوٹ لو۔ دین کا انعام بھی لے لو۔ اور دنیا کا بھی۔

سوال۔ آپ کے نزدیک اہلِ حق کا مسلک کیا ہے۔
جواب۔ سنت۔ محبوبؐ کی سنت

اس کی وضاحت کیلئے یہ بتا دینا نہایت ضروری ہے۔ کہ سنت کے اتباع کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس کے بغیر فرض کی ادائی بھی

غیر ممکن ہے۔ سجدہ فرض ہے اور وضو سنت ہے۔ اگر وضو نہ کیا جائے تو سجدہ کی ادائگی اور کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔

سجدہ کے تین مقام ہیں۔ شریعت کی رُو سے۔ طریقت کی رُو سے اور حقیقت کی رُو سے۔ اسی طرح وضو کے تین مقام ہیں۔ شریعت کی رُو سے۔ طریقت کی رُو سے اور حقیقت کی رُو سے ان مقامات تک پہنچانا بزرگانِ دین ہی کا کام ہے اور کسی کا نہیں

سوال۔ ایاکَ نعبُدُ وَ ایاکَ نستعین کی تشریح فرمائیں۔ اس آیت کریمہ کی عملی صورت کیا ہے۔

جواب۔ اس مقام پر وضاحت کے طور پر یہ بتا دینا نہایت ضروری ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بندگی کا قاعدہ کلیہ یہ رکھا ہے کہ بندگی کرنے والا پہلے اس کا ہو جائے تو بندگی یعنی عبادت ہے۔ ورنہ نیک عادت ہے۔ اور نیک عادت کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔

جو بندہ اللہ تعالےٰ کا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔ اور جو مدد وہ مانگتا ہے اسے اللہ تعالےٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ اس مرحلہ پر یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ بندگی حال ہے۔ اور مدد مستقبل ہے۔ اسی طرح بندگی دعوےٰ اور مدد شہادت ہے جس کا حال درست ہوگا۔ اس کا مستقبل بھی درست ہوگا۔ اور جس کا دعوےٰ حقیقت پر مبنی ہوگا۔ اس کی شہادت بھی صحیح ہوگی۔ ایسے

کم علمی اور نادانی ہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ جس بندہ کا اللہ تعالیٰ ہو جائے وہ کسی اور سے مدد مانگنے لگے۔ اگر بندگی کا دعوےٰ صحت پر ہے۔ تو مدد بھی اپنے حقیقی آقا ہی سے مانگنی چاہیئے۔ جو بندہ اللہ تعالےٰ سے پاک ہو جاتا ہے وہ اس کے بندوں کے لئے غرض و غایت✝ سے پاک ہو جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالےٰ خود اپنے محبوبؐ اور اپنے بندوں سے غرض و غایت سے پاک ہے۔ لہذا وہ اسے اپنا خصوصی تقرب عطا فرما دیتا ہے۔ اور اس کی ہر مدد کو ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ خواہ وہ اس کی خواہش کرے یا نہ کرے۔

سوال۔ قرآن فہمی کیلئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

جواب۔ قرآنِ پاک اللہ تعالےٰ کا حکم ہے اور حکم میں جاننے کی شرط ہی نہیں رکھی اللہ تعالےٰ نے۔ حکم ماننے والے کو حضوری اور جاننے والے کو دوری ہوتی ہے۔ ابلیس کا واقعہ اس کی شہادت ہے۔ اسی لئے مومن کی شان شانِ تسلیم ہے۔ لہذا حکم کو ماننا رحمت اور جاننا زحمت ہے۔

تاہم اگر قرآنِ پاک کو جاننا ضروری ہی سمجھتے ہو تو بزرگانِ دین کو جانو۔ اگر بزرگانِ دین کو نہیں جانا جائیگا تو اس کی عدم موجودگی میں قرآنِ حکیم کا جاننا انسانی ناقص علم سے ہوگا۔ اس سے علم الٰہی حاصل نہ ہوگا۔ اسی ضمن میں

✝ یہاں اور دوسرے ایسے ہی مقامات پر غرض و غایت سے مراد ذاتی غرض و غایت ہے۔ دین حقہ کی خدمت کی غرض و غایت کا مقام ہر حال قائم رہتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ قرآنِ حکیم قول پر نہیں اترا عمل پر اترا ہے۔ وہ اس لئے کہ قول مستقبل ہے اور عمل حال ہے۔ جو قوم یا فرد اپنے حال کو بزرگانِ دین کے نقشِ قدم پر چل کر نہ سنوار سکے اس کا مستقبل کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ حال دعویٰ ہے اور قرآنِ پاک اس کا شاہد ہے اگر دعوےٰ ہی درست نہ ہو تو شاہد کہاں سے آئے گا۔ اور کیا کرے گا۔

سوال۔ اللہ تعالےٰ کی نصرت کا مفہوم کیا ہے اور اس کا مقام کیا ہے۔

جواب۔ صلوٰۃ وسلام اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے محبوب صلعم پر۔ اس کا مقام محبوب صلعم کا قدم ہے۔

وضاحت۔

یہاں یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے محبوبؐ پر صلواۃ وسلام بھیجنا مخلوق کی طرح محض قول سے نہیں ہے۔ وہ اپنے پیارے پر اپنی پاک جماعت یعنی فرشتوں کے ساتھ عملی طور پر صلواۃ وسلام بھیجتا ہے۔ وہ ملائکہ کو حکم دیتا ہے۔ کہ محبوبؐ اور اس کی اتباع کرنے والوں پر انوار، رحمتوں اور برکتوں کی بارش کر دو۔ اور ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے اللہ تعالےٰ کی نصرت کا مرکزی مقام قیامت تک کے لئے وہ اہلِ حق قرار پاتے ہیں جو اس کے محبوبؐ کے نقوشِ قدم پر قدم رکھ کر راہِ حق میں آگے بڑھتے ہیں۔ اور انہیں خود حضور

علیہ السلام کے نقشِ قدم† کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

جب یہ اہلِ حق اپنے اہلِ حلقہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حبیبؐ پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں تو ان پر اور ان کے اہلِ حلقہ پر برکاتِ الٰہیہ بارش کی صورت میں نازل ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور سب کو بغیر مانگے بحصہ مساوی تقسیم ہو جاتی ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے کا کرم ہے۔ کہ ثناخواں محبوب صلعم کی جن صفات کو دیکھ لیتا ہے۔ اور اُن کا ذکر کرنے لگتا ہے وہی صفات اسے عطا ہو جاتی ہیں۔ اس مقام پر کہا گیا ہے ؎

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم
صد شکر کہ ما ایم میانِ دو کریم

† نقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت نے بطور ثبوت وشہادت ذیل کی وضاحت فرمائی ہے۔

محبوب صلعم کے قدم کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف عطا فرمایا ہے۔ کہ آپؐ کے قدم کو تمام علوم کا معدن قرار دے دیا ہے۔ اس لحاظ سے علم حضورؐ کے قدم کی صفت ہے اور بزرگانِ دین کا قدم شریعت اور ان کا نقشِ قدم طریقت ہے۔

اس مقام پر یہ بھی واضح رہے کہ شریعت قدم کی ابتدا ہے۔ معرفت قدم کی انتہا ہے اور حقیقت قدیم ہے۔

اس کی عملی وضاحت کیلئے بزرگانِ دین سے رجوع کرنا چاہئے کتاب و شنید سے نہیں

ہیں۔ مسلمان تو شاہد ہیں ہاتھ، آئین اور زبان عبرانیوں سے پاک (سلطان الحقیقت)

سوال۔ اسلام میں ملکیت کا تصوّر کیا ہے۔

جواب۔ ایاکَ نعبدُ۔ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں)

وضاحت۔ یہ کہہ کر ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم اللہ عزّوجل کے عبد+ ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ عبد کی ذاتی ملکیت کوئی نہیں ہوتی اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے۔ اسی کی ملکیت ہوتا ہے جس کی وہ خود ملکیت ہوتا ہے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مالک کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ سب عبد کا ہوتا ہے۔ اس میں سے ایک رتی بھی کم نہیں ہوتا۔

لہٰذا اسلامی تصوّرِ حیات میں فرد (بحثیت عبد) اتنا ہی محفوظ ہے جتنا اس کا آقا (پالنے والا) ہوتا ہے۔

سوال۔ دین کے لئے دانش کس قدر ضروری ہے۔

جواب۔ صرف اسی قدر کہ بزرگانِ دین کو سمجھ لیا جائے اور بس۔

سوال۔ جمال کسے کہتے ہیں۔

جواب۔ رنگ و بو کی موزونیت اور اعضاء کے تناسب کا نام جمال نہیں ہے۔ جمال توبہ کو کہتے ہیں۔ توبہ سے جمال نکھرتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تو اپنے بندوں سے اعمال کے بارے میں بازپرس نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ معصومیت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بخشی تھی اس کی واپسی کا مطالبہ کرے گا۔ واضح رہے کہ اہلِ حق کے نزدیک معصومیت پاکی کو کہا جاتا ہے۔

+ غلام

چند دوسری نوعیّت کے سوالات

بعض لوگ تقدس مآب کی شگفتگی طبع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اِس نوع کے سوالات بھی کر گزرتے ہیں ـــــ

سوال۔ شئے مرئی ایک ہوتی ہے اور آنکھیں دو لیکن دونوں آنکھیں دیکھتی ایک ہی چیز ہیں۔ اس کا سبب؟

جواب۔ وہ اسلئے کہ ایک چیز پر دونوں آنکھوں کا فوکس (FOCUS) ایک ساتھ جا کر پڑتا ہے۔ اگر کسی ایک آنکھ کا فوکس کہیں راستہ میں کٹ جائے یا کمزور پڑ جائے تو ایک شئے کی دو نظر آنے لگیں گی۔

سوال۔ اعضاء کا پھڑکنا کس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کیا انکی کوئی تعبیری نوعیت بھی ہوتی ہے؟

جواب۔ نہیں۔ کوئی تعبیری نوعیت نہیں ہوتی۔ جس مقام سے آکسیجن (OXYGEN) آسانی سے پاس نہیں ہوتا۔ اس سے متعلقہ عضو پھڑکنے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا کسی وہم میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

سوال۔ جسم کے کسی مقام پر داخلی یا خارجی طور پر سوزش یا جلن کا کیا سبب ہوتا ہے؟

جواب۔ جسم کے طبعی نظام کو برقرار رکھنے کیلئے بدن میں خون، پانی اور ہوا کی ایک خاص مقدار ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جب کسی وجہ سے کسی مقام پر پانی کی مقدار کم ہو جاتی ہے تو اس جگہ فیبرین (FIBRIN) کی مقدار میں بھی کمی واقعہ ہو جاتی ہے۔ اور فیبرین کی کمی سوزش اور جلن پر منتج ہوتی ہے۔

ایک تاریخی استفسار

معتزلہ

خلافت راشدہ کے فوراً بعد دین میں طرح طرح کے فتنوں نے سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ان فتنوں کی بنیاد وہ فرضی مسائل تھے جو عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کی طرف سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لئے پھیلائے جاتے تھے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے زمانہ میں یہ مفروضہ مسئلہ بڑے تنازعہ کا باعث بنا ہوا تھا۔ کہ ایک شخص توحید و رسالت اور حیات و موت کا تو قائل ہے۔ لیکن وہ اوامر و نواہی کی پابندی نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں وہ مومن ہے یا کافر۔

اس پر لوگوں کے دو گروہ بن چکے

تھے اور جابجا اختلافی مباحث نے زور پکڑ رکھا تھا

ایک دن یہ مسئلہ خواجہ حسن بصریؒ کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا۔ آپ نے اسے سن کر سکوت فرما لیا۔ لیکن واصل بن عطا جو آپ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ جھٹ بول اٹھا۔ "اے سائل، جس شخص کے متعلق تو پوچھ رہا ہے وہ نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ وہ فاسق و فاجر ہے" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چلا گیا اور اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ ہی مجلس سے نکل گئے۔ اس واقعہ کے بعد اس نے الگ دوسری مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

خواجہ حسن بصریؒ کے ایک مرید نے انہیں اطلاع دی کہ واصل بن عطا جو کل تک حضور سے اکتساب علم کر رہا تھا ایک الگ مسجد میں درس دے رہا ہے۔ اس پر حضرت خواجہؒ نے فرمایا۔ "قد اعتزال منی" اس نے ہم سے اعتزال (یعنی انحراف) کیا ہے تو اس طرح اس گروہ کا

نام معتزلہ پڑ گیا۔

یہ تمام واقعہ پیش کر کے تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت سے ذیل کا سوال پیش کیا گیا۔

سوال۔ معتزلہ کی حقیقت کیا ہے اور خواجہ حسن بصریؒ کے سکوت کا کیا سبب تھا۔

جواب۔ اگر محبوب کا بولنا علم سے ہوتا ہے تو کیا خاموشی علم سے نہیں ہوتی۔ جب خواجہؒ نے سکوت فرمایا تھا تو وہاں بھی علم ہی جلوہ گری کر رہا تھا۔ اسے بزرگانِ دین مقام خوف فرماتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل کے لیے تقدس مآب حضرت سلطان الحقیقت یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

وہاں امکان تھا کہ فسق و فجور میں مبتلا شخص توبہ کر لیتا۔ اگر اس مقام پر حضرت خواجہ حسن بصریؒ یہ فرما دیتے کہ وہ مسلمان نہیں تو وہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ذمہ پڑ جاتا۔ اور یہ فیصلہ آنے والی مخلوق کے راستہ میں آڑ بن کر کھڑا ہو جاتا۔

مقامِ خوف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی ایسی بات منکشف ہو کر جس میں مخلوق کے نقصان کی صورت پیدا ہو جائے تو بزرگانِ دین زبان سے کچھ ارشاد نہیں فرماتے۔ اور یہی علم اور حقیقت کا اقتضاد ہوتا ہے۔

واصل بن عطا جو حضرت خواجہ رح کی حضوری میں بیان کر رہے تھے۔ وہ لاعلمی کا بیان تھا۔

اللہ تعالیٰ کا محبوب اللہ تعالےٰ سے خائف رہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت خواجہ حسن بصری رح نے خوفِ خداوندی سے کچھ نہیں فرمایا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ موت آنے سے پہلے اگر فاسق و فاجر اللہ تعالیٰ کے دربار میں سچے دل سے تائب ہو جائے تو اس کی رحمت اسے کبھی مایوس نہیں کرتی۔ اور اس کا قصور معاف کر دیا جاتا ہے۔ وہی خاطی توبہ قبول ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا بندہ اور محبوب صلعم کا امتی کہلانے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ اس کی صلائے عام ہے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

پیارو، تین ہی مقام ہیں۔ فرمان اللہ تعالیٰ کا۔ اتباع اللہ تعالیٰ کے محبوب صلعم کی اور ارشاد حاضر وقت بزرگانِ دین کا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے۔ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم"

فاسق و فاجر اللہ تعالےٰ کے حکم سے بھی گذر رہا ہے اور محبوب صلعم کی اتباع پر بھی کاربند نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں حاضر وقت بزرگانِ دین کا اس کے لئے نہ بولنا ہی رحمت ہے۔ ایسے خطاکار کے خلاف فتویٰ صادر کرنا رحمت کے دروازے بند کرنے کے مترادف ہے جو مقام محبوبیت کے شایان شان

نہیں ہے۔ بزرگانِ دین تو خدا کے بندوں کو اس کی رحمتوں اور برکتوں کی آس دلا کر اس سے جوڑنے آتے ہیں۔ اس سے مایوس کر کے توڑنے نہیں آتے۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت جلال الدین رومی رح فرماتے ہیں ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

مزید براں محبوب کا منشاء ساری کائنات کو غرض و غائیت سے پاک کر کے اللہ تعالےٰ سے واصل کرنا ہے۔ لہٰذا وہ ہر مقام پر محتاط رہتا ہے۔ اور اسے اکثر سکوت اختیار کرنا پڑتا ہے۔ حدیث پاک میں اسی لئے حضور پُر نور صلعم نے فرمایا ہے۔ "میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خائف ہوں"۔ وہ اس لئے کہ بادشاہ سے جتنا وزیر خائف ہوتا ہے اتنا اور کوئی نہیں ہوتا۔

حضرت خواجہ رح جانتے تھے کہ اللہ تعالےٰ گنہگار کو معاف کر دیتا ہے بولنے والا (واصل بن عطا) یہ علم نہیں رکھتا تھا۔ وہ یہی جانتا تھا کہ جو گنہگار ہے وہ گنہگار ہی رہے گا۔

محبوب (حضرت خواجہ حسن بصری رح) کا اس موقعہ پر نہ بولنا عین بولنا تھا اور بولنے والا (واصل بن عطا) بالکل بے محل تھا، اس کا بولنا بے موقعہ اور غیر بولنا تھا جو نہ بولنے کے مترادف تھا۔

جب کسی مقام پر غیر بولی بولی جائے تو وہ مقام غیر ہو جاتا ہے اور وہاں نفس کا تسلط ہو جاتا ہے۔ غیر راستہ جاری ہو جاتا ہے۔ عقل

کو دخل ہو جاتا ہے۔ خرد و ہوش جلوہ گری کرنے لگ جاتی ہے ، صداقت چلی جاتی ہے۔ اور تمثیل جاری ہو جاتی ہے۔ اس سے صاحب تمثیل کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور اس کے ساتھ ربط و ضبط رکھنے والوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ انہیں دین و دنیا کی غفلت آ گھیرتی ہے۔ وہ ایک ایسا راستہ بن جاتا ہے۔ جو خرد و ہوش اور کتاب و شنید ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ روحانیت سے پیدا شدہ حقائق اس سے بعید ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا† چکر ہوتا ہے جس سے کبھی فراغت نہیں ہوتی۔ اس مقام پر حضرت مولوی غلام رسول فرماتے ہیں ؎

---

† امام فخر الدین رازیؒ جن کی تمام عمر کتاب و شنید اور استدلال میں گذری ہے۔ کتاب و شنید کے راستہ کی ناہمواری اس طرح ظاہر فرماتے ہیں ؎

ارباب العقول عقال — واکثر سعی العلمین ضلال

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا — سوی ان جمعنا فیه قیل وقال

اہلِ عقل (کتاب و شنید) کا علم الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ اور اکثر اہلِ عقل کی کوششیں گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔ اور ہم نے اپنی تمام عمر بحث سے اس کے سوا کچھ حاصل نہ کیا کہ تمام عمر قیل و قال میں گذار دی۔ ان کے بارے میں حضرت جلال الدین رومیؒ یوں فرماتے ہیں ؎

گر باستدلال کارِ دیں بدے — فخر رازی رازدارِ دیں بدے

یعنی قیل و قال ہی سے کام چل جاتا تو فخر الدین رازیؒ دین کے رازدار بن جاتے۔

اجیا چیت طبیب حقانی تے کھولے راز نہانی

دل دل موڑ دلوں گمراہی نور دتی عرفانی

داگاں دل مقصود چلائیاں موڑ گراہواں اونیں

واہ سید نقلین محمدؐ تر گئے عالم دونیں

ایسے گڑھے میں گرے ہوئے انسانوں کو جس وقت نکالنا مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے طبیب کو ناگہاں اچانک بھیج دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو قسم کے طبیب آتے ہیں۔ روحانی اور جسمانی۔ طبیب کامل وہاں اچانک آجاتا ہے۔ اور جس راز سے مخلوق کو الجھن ہوتی ہے وہ راستہ کھول دیتا ہے۔ اور جو گمراہی کی طرف دل مائل ہو چکے ہوتے ہیں۔ انہیں ترغیب دلا دلا کر اور بلا بلا کر نور† و عرفان کی نعمت عطا کی جاتی ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالےٰ کا منشا مخلوق کو نقصان دینے کا نہیں ہے۔ جو انسان توبہ کر لیتا ہے اللہ تعالےٰ اسے معاف فرما دیتا۔ دوسرے بھائیوں سے اگر کوئی گناہ

---

† نور کیا ہے؟ — اللہ تعالےٰ کے ساتھ پاک رہا جائے۔

عرفان کیا ہے؟ — اللہ تعالےٰ کے محبوب صلعم کے ساتھ باوضو رہا جائے۔

ہدایت کیا ہے؟ — اللہ تعالےٰ کے ذکر میں مشغول رہا جائے۔

انعام کیا ہے؟ — درود پاک میں مصروف رہا جائے۔ یعنی محبوب صلعم پر فردی صورت میں بھی اور جماعت کی صورت میں بھی درود اور صلوٰۃ و سلام بھیجا جائے۔

سرزد ہو جائے تو ان پر فتویٰ لگانا منع ہے۔ یہ کہہ دینا کہ معاف نہیں ہو سکتا سخت لاعلمی کا ثبوت دینا ہے۔ اہلِ حق کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اگر کوئی انسان گنہگار کو دیکھا دیکھی خود گناہ کا ارتکاب کرے تو وہ اپنے اوپر خود فتویٰ لگائے کہ تجھے یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔

لہٰذا ہر شخص کو چاہیئے کہ اپنا محاسبہ آپ کرے۔ جو شخص اپنا احتساب کرتا ہے۔ اور گناہوں سے تائب ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے گناہوں سے بچا رہتا ہے۔ اور پاک ہو جاتا ہے۔

اور وہ شخص جو اللہ تعالےٰ کی مخلوق پر فتوے صادر کرنے شروع کر دیتا ہے۔ وہ خود گناہگار ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے اپنے آپ سے گناہ ہو تو بولے۔ کیونکہ یہ بولنے کا مقام ہے اور اگر مخلوق اللہ میں کوئی گنہگار نظر آئے تو وہاں خاموش رہے کیونکہ اللہ تعالےٰ کریم ہے۔ نہ جانے اس پر کس وقت کرم ہو جائے البتہ گناہگار کیلئے دعا ضرور کرے۔ اور وہ دعا یہ ہو کہ اللہ تعالےٰ محبوب صلعم کی بدولت اسے معاف کر دے۔ اور اپنے لئے یہ دعا کرے کہ یا اللہ ہمیں ایسے گناہوں سے محفوظ رکھ اور ہماری ایسے ہی حفاظت کر جیسے ہر مقام پر بزرگانِ دین کی کیجاتی ہے۔ تو ہی اپنی مخلوق کا محافظ اور حامی و ناصر ہے۔

اس مقام پر یہ جان لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ اور ساری مخلوق کے عیب و ہنر دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی مخلوق کو ڈھیل دیتا رہتا ہے۔ اس لئے اور کسی کو اللہ تعالےٰ کے حکم میں اور اس کے محبوبؐ کے سامنے زبان

کھولنے کا حکم نہیں ہے۔

خاموش رہنے والا صاحبِ حال ہوتا ہے۔ اور بولنے والا صاحبِ قال۔ صاحبِ حال بامراد ہے اور صاحبِ قال بے مراد یعنی خالی ہے۔ اس لئے بامراد کا راستہ ہر مقام پر بامراد رہتا ہے۔ اور کامیاب رہتا ہے۔ اور بے مراد ہمیشہ تمثیل کے در پے اور ناکام رہتا ہے۔ اسی لئے حضور پُر نور صلعم نے فرمایا ہے۔ کہ تمثیل کرنے والا غدار ہے۔ لہٰذا محبوب کا بولنا بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور خاموشی بھی اللہ تعالےٰ کے لئے ہے۔ محبوب کا بولنا علم سے ہوتا ہے اور خاموشی خوف و رجا سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فضل و کرم کرے غیر سے محفوظ رکھے۔ خیر کا شرف عطا فرمائے اپنی ساری مخلوق کو بزرگانِ دین کی دعا و برکت سے۔ آمین ! ثم آمین !!

تاثرات

بلاتبصرہ

یہ تاثرات روزنامہ امروز کے نمائندہ جناب اکمل علیمی صاحب کے ہیں۔ یہ آپ نے اپنے کالم "یہ لاہور ہے" میں مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۶۸ء کے امروز میں پیش فرمائے ہیں۔ ہم انہیں بغیر کسی ذاتی تبصرہ کے دے رہے ہیں۔

ابو مسلم صحافی

—— یہ لاہور ہے ——

نورو والوں کا ڈیرہ

جہاں عمل قول کا شاہد ہے

—— اکمل علیمی ——

خواجہ صاحب ایک عرصے سے مجھے بتا رہے تھے۔ کہ دھرم پورہ میں ایک درویش مقیم ہے۔ جو نیک آدمی ہے۔ نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ اور روزانہ سو دو سو افراد کو کھانا کھلاتا ہے۔ خواجہ صاحب بتایا کرتے تھے کہ یہ بزرگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے اس شخص پر علم ارزاں کیا ہے۔ وہ زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں

سوالوں کا اطمینان بخش جواب مہیا کرتا ہے۔ اور ملنے والے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے میرے کان میں کہا بزرگ بڑی کرامتوں کا مالک ہے۔ اور یہ جو روزانہ سو دو سو روپے خرچ کرتا ہے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیمیاگر بھی ہے۔

میں پیروں فقیروں کی تلاش میں گھومنا اور ان سے مرادیں مانگنا شرفِ انسانیت کی نفی خیال کرتا ہوں جو لوگ نیک ہیں میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ اور ان میں پیر فقیر بھی ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے خواجہ صاحب کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب ان کا اصرار بڑھا تو درویش کے ڈیرے پر چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور ہفتۂ رفتہ کی ایک دوپہر کو ہم تین آدمی بزرگ کے ڈیرے پہ پہنچے۔ میرا مقصد ایک شخصیت کے مطالعہ کے سوا کچھ نہ تھا۔

دھرم پورہ سے میاں میر صاحب کی درگاہ کو جانے والی سڑک پر نہر لاہور برانچ کے پل سے کوئی آدھ فرلانگ کے فاصلے پر بائیں جانب ایک قطعۂ اراضی میں سید نفضل شاہ صاحب کا حجرہ ہے۔ مریدوں نے انہیں سلطانِ حقیقت اور شیخِ ملت ایسے خطاب دیئے ہیں۔ اور انہیں "حضور" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور چونکہ یہ بعض لوگوں کی ارادت کا معاملہ ہے۔ اس لئے مجھے اس صورتِ حال پر کوئی تعجب نہیں۔ مجھے استعجاب کچھ اور باتوں پر ہے۔ جس کا تذکرہ ابھی کروں گا۔ سڑک کے کنارے جو قطعۂ اراضی اس بزرگ کے تصرف میں ہے۔

اس کے ایک طرف ایک مسجد کی بنیادیں رکھی جا چکی ہیں اور دوسری جانب نماز کی ایک جگہ بنی ہوئی ہے۔ اس قطعۂ اراضی میں ایک بے ترتیب سا باغیچہ ابھر رہا ہے۔ اور اس کے عقب میں کچی اینٹوں، سرکنڈوں اور گھاس پھونس کے بنے ہوئے تین کمرے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے ملحق ہیں۔ ایک کمرے میں دھواں تھا اور وہ ایک شہری تنور کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سامنے ایک چبوترے پر چند بڑے بڑے سیاہی مائل دیگچے پڑے تھے۔ ان کے قریب ایک آدمی چولہے پر چپاتیاں پکا رہا تھا۔ سامنے ایک چارپائی پڑی تھی۔ اور اس کے ساتھ کچھ خالی اور کچھ بھری ہوئی بوریاں، لکڑی، کوئلہ، چند بوسیدہ مٹکے، کنستر اور ایسا ہی بے ہنگم سامان پڑا تھا۔ دوسرے کمرے کو ڈیوڑھی سمجھنا چاہئے۔ جس پر چھت سرکنڈوں کی ہے۔ مگر دیواریں ٹاٹ اور پرانی دریوں سے بنائی گئی ہیں۔ ڈیوڑھی، چٹائیاں اور ان کے اوپر دیہاتی فرش بچھا تھا۔ ڈیوڑھی کے پیچھے ایک کمرہ ہے جو سطحِ زمین سے تین فٹ گہرا ہے۔ اس کمرے کو آرام گاہ سمجھنا چاہئے۔ اس میں کوئی کھڑکی اور روشندان نہیں۔ گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں "نِگا" رہتا ہے۔

گہرا کمرہ

جب ہم اس ڈیرے میں داخل ہوئے تو کوئی ایک درجن آدمی ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ کام کر رہے تھے۔ اور کچھ نماز میں تھے۔ ان میں دیہاتی اور شہری دونوں قسم کی صورتیں تھیں۔ لیکن سب

صورتوں پر ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور انہماک صاف دکھائی دیتا تھا۔ خواجہ صاحب نے لنگر خانے کے باہر زمین پر بیٹھے ایک بھاری بھرکم بزرگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "باباجی یہی ہیں" میں نے غور سے دیکھا۔ باباجی کو ہماری آمد کا احساس ہو چکا تھا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ سِل پر کوئی سبز دوا پیس رہے تھے۔ اور ان کے ہاتھ دوا کے محلول سے آلودہ تھے۔ وہ اس وقت کھلے دیہاتی کرتے اور تہبند میں ملبوس تھے۔ یہ کپڑے سوتی اور سادہ تھے۔ دوسرے لمحے ایک آدمی آیا اور وہ ہمیں کشاں کشاں گھر کے کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں چند آدمی پہلے سے بیٹھے تھے۔ ہم بھی آرام دہ فرش پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی آیا اور وہ خاموشی سے ایک دسترخوان ہمارے آگے بچھا کر چل دیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک اور آدمی آیا اور وہ سالن کے پیالے ہمارے آگے رکھ کر چلتا بنا۔ پھر چپاتیاں بھی آگئیں۔ چونکہ ہم یہاں کھانا کھانے کے لئے ہرگز نہیں آئے تھے۔ (فی الحقیقت میرے لئے ابھی کھانے کا وقت بھی نہیں تھا) اور پھر یہ کھانا ہمیں پوچھے بغیر ہمارے آگے رکھ دیا گیا تھا۔ اس لئے مجھے صورت حال پر کوفت آمیز استعجاب تھا۔ لیکن خواجہ صاحب نے بتایا کہ یہ یہاں کا معمول ہے جو بھی آتا ہے اس کے آگے کھانے پینے کی اشیاء رکھ دی جاتی ہیں۔ اُسے بھوک ہو تو کھائے نہ ہو تو نہ کھائے۔ یہ چونکہ بنیادی انسانی ضرورت ہے۔ اس لئے کسی سے استفسار کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ میں ابھی کھانے کے معاملے میں گومگو کی کیفیت ہی میں تھا کہ باباجی بھی کمرے میں داخل

ہوئے۔ اب انہوں نے اپنے سادہ کپڑوں پر ایک سیاہ جبّہ پہن رکھا تھا۔ جس کے گریبان کے کناروں پر سنہری دھاگے کا کام تھا۔ سر پر ایک سبز عمامہ تھا۔ اور شانوں پر گیروے رنگ کی ایک چادر تھی۔ وہ اپنے سارے انکسار کے باوجود ایک شان سے نمودار ہوئے اور آتے ہی سب کو کھانے کا اِذن دیا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی لقمے اٹھانے شروع کر دیئے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو مٹی کے پیالوں میں گرم گرم چائے آگئی۔ باہر ڈیوڑھی میں بھی کوئی درجن بھر آدمی کھانا کھا رہے تھے۔ اور باباجی ذاتی طور پر سب کی نگہداشت کر رہے تھے۔

جنّت اور دوزخ

باتیں شروع ہو گئیں۔ باباجی کم بولتے تھے۔ لیکن جب بھی زبان کھولتے تھے تو معنی خیز اور پُر لطف گفتگو کرتے تھے۔ پنجابی بولتے تھے تو اس میں دوآبے کی ساری مٹھاس آجاتی تھی۔ اور اردو بولتے تھے تو وہ بھی مترنم تھی ان کی گفتگو میں صوفیوں کی لغت کے تمام معروف الفاظ بڑی خوبصورتی کے ساتھ آ رہے تھے لیکن بیشتر حاضرین کے لئے وہ ناقابلِ فہم تھے۔ میں نے جنّت اور دوزخ کی حقیقت معلوم کرنا چاہی تو انہوں نے صوفیانہ جواب دینے کے بجائے متکلمین کے اس خیال کی تائید کر ڈالی کہ "اچھے کاموں سے جو سعادت اور بُرے کاموں سے جو شقاوت روحِ انسانی کو حاصل ہوتی ہے۔ وہی جنّت اور دوزخ ہے" میں نے مابعد الطبیعیات میں زیادہ دلچسپی ظاہر کی تو انہوں نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا۔ یہ زندگی بہت اہم اور قیمتی ہے۔ کیوں نہ ہم اس کی فلاح کے لئے کوشش کریں۔ سب کچھ یہیں

کا جو احساس ہوتا ہے بابا فضل شاہ کی صحبت میں بیٹھ کر مجھے وہ احساس نہیں ہوا۔ باباجی اپنی روائتی درویشی کے لبادے میں بھی بڑی تازہ گفتگو کر رہے تھے اور ایک صوفی کی زبان سے مادّی زندگی کی اہمیت پر زور زیادہ دلچسپ تھا۔ مادّہ اور روح کا تذکرہ چھڑا تو مَیں نے باباجی کو بتایا کہ جدید سائینس نے مادّے کو توانائی میں تبدیل کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا ہے اور وہ بالواسطہ طور پر روح کے وجود کی قائل ہو گئی ہے۔ لیکن یہ سوال اب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ مادّہ اور روح میں سے کون "قدیم" اور کون "حادث" ہے۔ باباجی نے اصرار کیا کہ روح قدیم ہے اور مادہ حادث ہے — اور متکلمین کے اس بیان میں کوئی صداقت نہیں کہ مادّہ اور روح دونوں قدیم ہیں۔ اور یہ کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر تقدّمِ ذاتی تو حاصل ہے مگر تقدّمِ زمانی حاصل نہیں یہاں انہوں نے تصوف کا لب ولہجہ اختیار کیا اور کہا۔ متکلمین جو دعوے کرتے ہیں وہ قول ہے۔ اور قول شاہد کے بغیر بے نتیجہ ہے۔ باتیں پُر معانی۔ دلچسپ اور لامتناہی تھیں۔ لیکن اس روز مَیں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ مَیں نے کہا باباجی آپ سے سینگ پھنسے گا۔ اِس وقت اجازت چاہتا ہوں۔ اُن کا جواب تھا۔ خیر و برکت ہے۔ مَیں سلام عرض کر کے اُٹھ آیا۔

رات کی بات

ہفتے کی شام خواجہ صاحب پھر آئے اور کہنے لگے باباجی کے پاس چلنا

مل جاتا ہے۔ والٹر روسو نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ باباجی رُوسو سے متعارف نہیں ہیں وہ کہنے لگے۔ انسان معصوم پیدا ہوا تھا۔ لیکن اب ہر جگہ گناہوں میں جکڑا ہوا ہے۔ انسان کو اپنی پیدائشی معصومیت کی بیش بہا متاع کی حفاظت کرنی چاہیئے۔

مقدمہ بے ثبوت

مَیں نے پوچھا کہ ساری انسانی جدوجہد کا مقصد انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود ہے یا اس مادی زندگی میں سے آگے تک جاتا ہے وہ کہنے لگے خالق کائنات نے تمام امتحانات اس دنیا میں رکھے ہیں گویا یہیں سے اعمال کے خیر و شر کا تعین ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کو انسانی زندگی کو خوبصورت اور ارفع دیکھنے کی تمنّا ہے۔ اور خداوندی تمنّا کو پورا کرنے سے بڑی عبادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ میرے دوست نے پوچھا کہ فی زمانہ تبلیغ کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔ انہوں نے سوال کے جواب میں ایک طویل بیان دیا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ عمل قول کا شاہد ہے اور ظاہر ہے جس مقدمے کا گواہ نہ ہو وہ قابلِ سماعت بھی نہیں ہوتا۔ تبلیغ اگر قول سے ہے تو وہ رائیگاں ہے۔ اور اگر عمل سے ہے تو وہ مؤثر ہے ہمیں چاہیئے کہ دوسروں کو کوئی معیار پیدا کرنے کی تلقین کرنے کے بجائے خود وہ معیار پیدا کریں۔ "ہاتھ امین اور نگاہ پاک ہونی چاہیئے"

پڑھے لکھے لوگوں کو نام نہاد پیروں، فقیروں کے پاس بیٹھ کر تضیع اوقات

چاہیئے باباجی کے گھرے کمرے میں کچھ بے غرض اور مخلص لوگوں کے حلقے میں بیٹھ کر مجھے یک گونہ راحت محسوس ہوئی تھی۔ اور چونکہ وہاں علم و حکمت کی باتیں بھی ہوئیں تھیں۔ اسی لئے مَیں نے دوبارہ وہاں جانے میں کوئی مضائقہ نہ جانا میرا خیال تھا۔ کہ درویش لوگ رات گئے تک ذکر و فکر میں مصروف رہتے ہیں۔ کسی بھی وقت جا بیٹھیں گے خواجہ صاحب نے آج کی صحبت کیلئے سہ پہر سے ہی ایک آدمی کو گرفتار کر رکھا تھا اور اس سے وہ بابا کے ڈیرے پر پہنچ کر پنجابی شعراء کا عارفانہ کلام سننا چاہتے تھے۔ یہ آدمی بھی میرے لئے کشش کا باعث تھا۔ تاہم دفتر سے نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔ اور جب ہم "نور والوں کے ڈیرے" پر پہنچے تو وہاں مکمل تاریکی تھی۔ اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

مَیں نے خواجہ سے کہا کہ سب لوگ آرام کر رہے ہیں۔ ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیئے خواجہ صاحب آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ حجرے کے دروازے پر ایک آدمی نظر آیا۔ جو غالباً پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی ڈیوڑھی کا پردہ سرکایا اور ہم اندر داخل ہوگئے دس بارہ آدمی لحافوں میں دبکے فرش پر سو رہے تھے۔ ایک دو اُٹھ بیٹھے۔ خواجہ صاحب نے ایک آدمی کو بتایا کہ باباجی سے ملنا ہے وہ گھرے کمرے میں گیا اور دوسرے لمحے ہمیں بھی اندر آنے کو کہا۔ اندر گئے تو دیکھا کہ وہاں بھی دس بارہ آدمی سو رہے ہیں۔ ڈیرے کے آدمی نے باباجی کو جگا دیا اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ باتیں ہونے لگیں تو یکے بعد دیگرے سارے لوگ بیدار ہو کر ایک نصف

دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ مَیں نے باباجی سے کہا۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ بے وقت آئے اور اتنے ہمارے بزرگوں کو بے آرام کیا۔ زیرِ لب بولے "کبھی جاگنے والے ہی تو جگاتے ہیں" مَیں اس جملہ پر چونک پڑا۔ باباجی اتنے بڑے بڑے کلمات عجب سادگی، آہستگی اور بے ساختگی سے کہہ جاتے ہیں۔ مَیں نے کہا۔ بہت سے بھائیوں کو بھی تکلیف ہوئی ہے۔ جواب ملا۔ بھائی! وہ سب ہمارے جیسے ہی ہیں۔ چند لمحوں کے بعد ہمارے آگے جانا پہچانا دسترخوان بچھ گیا۔ باباجی اُٹھے اور ایک کنستر سے ایک لفافہ نکال لائے اور اس میں سے مٹھائی نکال نکال کر متعدد پلیٹیں بھریں۔ اور سب حاضرین کے آگے رکھ دیں۔ پھر گرم چائے کے پیالے آگئے اور باباجی سب کو اصرار کر کے کھلانے پلانے لگے۔ "ہیر خواں" بشیر اور ہمارے ڈرائیور نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ باباجی خود اُٹھے باورچی خانے میں گئے ان کے لئے کھانا گرم کر لائے کھلانا پلانا ان کا محبوب مشغلہ ہے اور اسے وہ خدمت کہتے ہیں۔ بشیر ہیر پڑھنے لگا باباجی کو جو شعر اچھا لگتا تھا۔ اس کی داد دیتے تھے۔ اور اس پر نہایت معنی خیز تبصرہ کرتے تھے اور شعر کے موضوع پر دوسرے صوفی شعراء کے اشعار اور قرآنی آیات پڑھنے لگتے تھے میرے لئے یہ نشست بہت دلچسپ اور مفید تھی۔

بشیر پچھلے دنوں ٹائیفائڈ میں مبتلا رہا تھا۔ اور وہ خاصا کمزور تھا۔ نصف شب کے وقت جب ہم نے باباجی سے اجازت چاہی تو باباجی نے بشیر سے کہا آپ بیمار ہیں یہیں رہ جایئے۔ آپ کا کچھ بندوبست

کریں گے۔ بشیر فوراً تیار ہوگیا۔ اور ہم چلے آئے۔ اگلے روز بعد دوپہر ہم ڈیرے پر پہنچے۔ تو بشیر کو چاق و چوبند پایا۔ محفل پھر جم گئی۔ بشیر نے بابا فرید وارث، بلھے شاہ اور مولوی غلام رسول کے بیسیوں اشعار پڑھے بابا جی نے اُن میں سے بیشتر پر تبصرہ کیا اور خود بھی کئی عارفانہ اشعار سنائے۔ جب بشیر خاموش ہوگیا تو بعض حاضرین نے مجھے سوال کرنے پر اکسانا شروع کر دیا۔ گذشتہ دو نشستوں میں انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ یہ شخص بابا جی کی زبان سے ملتی جلتی زبان میں اُن سے سوال کرتا ہے ۔ اور مزیدار جوابات آتے ہیں۔ وہ مزہ لینا چاہتے تھے۔ لیکن میں ان ملاقاتوں میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ بابا جی سے سوال جواب میں اجتناب کار ہے وہ مجھے خاموش پاکر سب سے خطاب کرتے ہوئے بولے۔

"سوال نہیں جواب بنو" یہ کلمہ اُن کے فلسفۂ حیات کا لب لباب ہے۔ وہ سراپا عمل ہیں۔ اور عمل ہی کے خواہش مند ہیں۔ جو لوگ روزانہ ان کے ڈیرے پر آتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کچھ پانے کے لئے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ غرض مندوں کے لئے بابا جی کے پاس کچھ نہیں خواجہ صاحب کہتے ہیں۔ کہ پانچ برس کی عقیدت کے دوران میں نے بابا جی کو کوئی نذرانہ پیش نہیں کیا اور نہ مجھ سے ایسی توقع کی گئی ہے۔ انہوں نے دوسروں کو بھی بابا جی کی مالی خدمت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مگر وہ وسیع پیمانے پر لنگر چلتا ہوا دیکھ کر کہتے ہیں کہ حضرت کیمیاگر ہیں۔ میں بھی بابا جی کو کیمیاگر ماننے لگا ہوں۔ لیکن خواجہ صاحب اور میرے ماننے میں فرق ہے۔ بابا جی نے نکتہ کی ایک بات یہ کہی تھی کہ منوانے کی کوشش نہ کرو مان لو۔ نہ ماننے سے

جھگڑے پیدا ہوتے ہیں ایک بچہ سامنے آئے تو اُسے بھی مان لو۔ میں بابا جی کو کیمیاگر مانتا ہوں لیکن ان کے گرد جمع رہنے والے لوگوں کو بروقت خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ بابا جی کیمیاگر ضرور ہیں۔ لیکن وہ آپ کو راتوں رات امیر نہیں بنا سکتے اگر آپ کا ہاتھ امین اور نگاہ پاک ہو تو آپ روحانی طور پر مالا مال ضرور ہو سکتے ہیں اور اس صورت میں آپ سراپا کیمیا ہوں گے بابا جی کا قول عمل کی شہادت سے مشروط ہے اور اسی میں اُن کی عظمت اور برتری ہے۔

اِس دور میں تبلیغِ حق کیسے کی جائے

وقت کا ایک اہم سوال اور اس کا جواب

عصرِ حاضر میں انسان حقائق سے اس قدر دُور جا پڑا ہے کہ اسے ماضی کا کوئی اصول یا علم زندگی کے صحیح رُخ پر نہیں ڈال سکتا۔ مذہب سے یہ بیزار ہے اور اخلاقی اقدار کو فرسودہ سمجھتا ہے۔ جدّت پسندی کے شوق میں بُرے بھلے میں اس نے قطعاً امتیاز کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ ہر بات کو مادیّت کی زبان ہی میں سمجھنا چاہتا ہے۔ اور جسم جو فانی ہے اسی کی پرورش میں لگا ہوا ہے۔ اس کی نظر میں تن کی آسائش ایک وہ حقیقت بن چکی ہے جس کا انکار اس سے ہو ہی نہیں سکتا۔ روح کی حیثیت اس کے یہاں اب ثانوی بھی نہیں رہی ہے۔ یہ اسے بھی مادہ پر محمول کرنے لگا ہے۔ اور جسم کا مادّی جزو سمجھ کر اس کی فنا کا قائل ہو گیا ہے۔ لہٰذا حشر و نشر اور جزا و سزا کا تصوّر ہی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب یہ صورتِ حال ہے تو اُسے قدیم اصولوں کے تحت حقائق سے روشناس کرانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ انہی باتوں کے ذریعہ حقائق کو سمجھنا چاہے گا جو اس کی خود اپنی مسلّمہ اقدار کا درجہ رکھتی ہوں گی۔ اس لحاظ سے اس دور میں اہلِ حق کا کام نہایت دشوار ہو گیا ہے۔ لیکن مایوس کن حد تک نہیں۔ اس مرحلہ پر سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ کہ یہ صورتِ حال پیدا ہوئی کیوں ہے۔ اس کے بعد پھر کہیں جا کر دیگر امور پر غور کرنے کی گنجائش پیدا ہو گی۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ حقائق کو سمجھنے کے لئے یہ کجی فکر عسلم کی غلط تولین سے پیدا ہوئی ہے۔ اسس مقام پر کسی نے کیا خوب کہا ہے سے

بے حقیقت علم و عرفاں کا کوئی حاصل نہیں
اسس اُجالے میں بھی اکثر ٹھوکریں کھاتے ہیں لوگ

عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ علم کتاب و شنید سے ہے۔ اسس کے لئے شواہد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قدما کی نظری بحثوں اور ان کی من جاتی تاویلوں ہی کو علمی سرمایہ سمجھ کر فطرت اور اسس کے اصولوں کی طرف سے قطعاً چشم پوشی کر لی گئی ہے۔ کتاب و شنید کی رو سے ہر اس شخص کے سر دستارِ فضیلت باندھ دی گئی ہے۔ جو ماضی میں اپنی زبان اور قلم کا لوہا منوا چکا ہے۔ حالانکہ کسی بات کا منطق کی رُو سے صحیح ہونا اور ہے اور حقائق کی رُو سے صحیح ہونا اور۔ منطق کا گھر صغری و کبری کے کلیوں اور تشبیہات و استعارات وغیرہ سے پورا کر لیا جاتا ہے۔ وہ اسس لئے کہ اسس کے مسائل کی حیثیت محض نظری ہوتی ہے۔ لیکن حقائق کو فطری اور ٹھوس قوانین کے تحت منوانے کے لئے عملی شواہد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک کھیت کو قلم اور زبان سے نہیں بویا اور جوتا جا سکتا۔ اسس کے لئے ہل اور دیگر آلاتِ کشاورزی ہی درکار ہوتے ہیں۔ اور فنی مہارت اسس سے مستزاد ہوتی ہے۔

اب اگر کوئی علم بیان کا ماہر قرطاس و قلم لے کر فنِ کاشتکاری پر کچھ تحریر کرے گا تو وہ سبزہ زار کے انہی پہلوؤں کو ابھار کر سامنے لائیگا

جو اسس کے اپنے فن کو تقویت بخشتے ہوں گے۔ یہی حال مصوّر کا ہوگا۔ ان تمام کاغذی کھیلوں میں حقیقت یعنی فن کاشتکاری کو بہت کم دخل ہوگا۔ فنِ کاشتکاری کو ایک کاشتکار ہی خوب اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ماہرِ علم بیان یا مصوّر نہیں۔ وہ اس لئے کہ عملی شواہد کی ضرورت کو منطقی دلائل اور ایک مصوّر کا برش پورا نہیں کر سکتا۔

حقائق پر ماضی کی نظری بحثیں بس اسی نوعیت کی ہیں۔ وہ علمائے حقیقی جنہوں نے علوم کو دریافت کیا ان کی حیثیت کسان یا کاشتکار کی ہے۔ اور جنہوں نے انہیں آسان کرنے کے نام پر اپنے نظریات قائم کئے وہ محض اہلِ بیان اور اہلِ قلم ہی تھے۔ عملی شواہد سے انہیں بہت کم تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سقراط اور افلاطون کی علمی دریافتوں کو ارسطو کی سطحیت، کرشن کی تعلیم کو شری شنکر آچاریہ کی مصلحت اور اسلام کے سیدھے سچے اصولوں کو معتزلہ اور اشاعرہ کے نظری مباحث نے بہت سخت نقصان پہنچایا ہے۔

اسس مقام پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر کتاب و شنید کو علم کا درجہ نہ دیا جائے تو پھر حصولِ علم کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور کن اقدار کو اپنایا جائے۔

اسس کے جواب کے طور پر یہ بتا دینا ہی کافی ہوگا کہ کتاب و شنید کا درجہ قول کا ہے علم کا نہیں ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قول علم کی جانب پہلا قدم ہوتا ہے۔ ہمارے اسس بیان کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ محض قول پر ہی بسر کر کے نہیں بیٹھ جانا چاہئے۔ عمل کی چھلنی اور چھاج میں

اس کی چھان پھٹک نہایت ضروری ہوتی ہے۔ کسی بھی غلہ سے چھانے پھٹکے بغیر غذا کا کام نہیں لیا جاتا۔ لہذا ہر قول کو برتنے کے لئے عمل کی کسوٹی پر پرکھنا نہایت ضروری ہے۔ جب قول عمل کی شہادت سے سچا ثابت ہو جاتا ہے۔ تو اسے علم کی آنکھ عطا کر دی جاتی ہے۔ اور اخلاص اس کا انعام قرار پاتا ہے۔

اس لحاظ سے کسی شے کی ماہیت یا حقیقت تک پہنچنے کے لئے پہلے قول، اس کے بعد عمل۔ اس کے بعد علم اور اس کے بعد اخلاص کا درجہ آتا ہے۔ قول کو علم کا درجہ دینے سے وہی خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں جو آج ہو رہے ہیں، یعنی انسان علم کے نام پر جہلِ مرکّب کا مریض بنتا چلا جاتا ہے ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

علم کے مقام کو جان لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے، کہ حقائق کیا ہیں۔ انسان کو جب حقائق کا علم ہو جاتا ہے تو اُسے حق کے اصل مقام سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اعلےٰ اقدار کو بھی سمجھنے لگ جاتا ہے۔ مادیت کی تاریکیاں چھٹنے لگ جاتی ہیں اور دینِ حق جلوہ گری کرنے لگ جاتا ہے۔ جب یہ ہو جاتا ہے۔ تو اچھے بُرے میں امتیاز کرنا آجاتا ہے۔ اور یہی انسانیت کی معراج ہوتی ہے۔

حقائق میں پہلا اور مرکزی مقام انسانیت کو حاصل ہے، عقل، علم مذہب اور اصول سب اسی کے گرد گھوم رہے ہیں گویا زندگی کی ہر قدر اسی کے لئے ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اس مقام پر ایک صاحبِ حال

بزرگ بلھے شاہ فرماتے ہیں ؎

بلھیا رب کو نہ کو
آئی صورت توں سچا رو

اس مرحلہ پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ انسانیت کیا ہے۔ جائز و ناجائز طریقہ سے تن پروری یا مساوی حقوق کی بہم رسانی کے ذریعہ (فکر انسانی کی آزادی اور بلندی کو قائم رکھتے ہوئے) روح کی آسودگی؟ ظاہر ہے کہ پہلے نظریہ کو انسانیت کی عظمت ہرگز نہیں اپنا سکتی۔ ان دونوں نظریوں میں سے صرف دوسرا نظریہ ہی اس قابل ہے کہ اُسے اپنا کر انسان فخر کر سکتا ہے۔ بس اسی کے لئے ماضی میں اعلےٰ انسانوں نے اصول وضع کئے۔ آسمانی ہدایتوں کو مذہب اور دین کی صورت میں مشعلِ راہ بنایا اور طرح طرح کے علوم کو دریافت کر کے تاریک راہوں کو پُر نور کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اس دور کے انسان نے اس اصولِ زندگی کو اپنانے سے یکسر انکار کر دیا۔ اور تن پروری کو اپنا شعار بنا لیا۔ حالانکہ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ تن فانی ہے۔ باقی رہنے والی انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور حق ہی ہے انسانیت دوستی کا ثبوت فراہم کرنے کیلئے ہر ایک کو اسی قدر کو اپنانا پڑے گا۔ اور کسی کو نہیں۔ لہذا ہر علم کا استعمال اسی نظریہ کے تحت ہونا چاہیئے اگر مادی اقدار کے لئے علوم کا استعمال ہوگا۔ تو تباہی پھیل جانا یقینی ہے۔ اس مقام پر مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود

لہٰذا حقائق میں "انسانیت" کی شق ہی ایسی ہے جو فوری طور پر انسان کے برتنے کی چیز ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اسی کی جزئیات کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ اور باقی کو پھر کسی صحبت کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے۔

انسانیت کو فروغ دینے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ انسان ایسا ہی پاک ہو جائے جیسا خداوند تعالےٰ خود ہے۔ اس نے انسان کو پیدا تو کیا ہے۔ لیکن اس سے کوئی اپنی غرض و غائیت وابستہ نہیں رکھی۔ یہی اس کی پاکی ہے۔ جو انسان اور انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہو اسے بھی سنتِ الٰہی پر چل کر اپنے آپ کو پاک کر لینا چاہیئے۔ مادّی غرض و غائیت کی نجاست وہ نجاست ہے جسے کوئی پانی پاک نہیں کر سکتا۔ ہزار غسل یا لاکھ وضو کئے جائیں۔ عطر و گلاب میں اپنے آپ کو لبا لیا جائے پھر بھی مادّی غرض و غائیت کی نجاست مشامِ زیست کے لئے تعفن کا باعث ہی بنی رہے گی۔ اور اس مقام پر یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ اس نجاست سے پاکی انسان کو اسی وقت میسر ہوتی ہے جب توفیقِ ایزدی شاملِ حال ہو یا وہ کسی پاک کے ساتھ لگ جائے۔ کتاب و شنید سے اس کا حصول نہایت دشوار ہے۔

جب کسی صاحبِ توفیق کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو اسے دو (۲) شہادتیں فراہم ہو جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ اس کا ہاتھ امین ہو جاتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اس کی زبان برائیوں سے پاک ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی

اس کا کوئی فعل مادّی غرض و غائت کے تحت نہیں رہتا۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، اپنے ہم جنسوں اور دیگر مخلوق کی بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ اخلاص اس کا انعام ہوتا ہے اور کائنات کی ہر طاقت اس کی خدمت پر مامور کر دی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ حق کا صحیح مبلغ ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے زیادہ اس کا عمل بولتا ہے۔ یہ جس بات پر عمل کرتا ہے اسی کی تبلیغ کرتا ہے۔ اسی کو شریعتِ اسلامیہ کی اصطلاح میں مردِ مومن کہا جاتا ہے۔ اور اسی کے لئے کہا گیا ہے۔ ؏

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ملفوظات

بزرگانِ دین کے اقوال منطقی استدلالات کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ وہ سچّوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہوتی ہیں، اور وارداتِ قلبی ہی کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سُننے اور پڑھنے والوں کی دلوں کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ اور ہوش و خرد کے لئے زندگی کی تاریک راہوں میں شعلہ بسر مشعلوں کا کام دیتے ہیں اور اُن سے اندھیرے چھٹتے چلے جاتے ہیں۔ بہر حال ان کا سوچا، کہا اور کیا ہوا روشِ عام سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ انہیں دوسروں کی آواز میں آواز ملانی نہیں آتی اور نہ وہ اُسے پسند ہی کرتے ہیں ؎

در مذہبِ عاشقاں قرارے دگر ست
ویں بادۂ ناب را خمارے دگر ست

صحافی

ملفوظات

قول نہ سچا ہوتا ہے نہ جھوٹا۔ عمل کی شہادت سے وہ سچا یا جھوٹا قرار پاتا ہے۔

○

جس عمل کی بنیاد محبت پر ہوگی وہ دائمی ہوگا اور جو کتاب وشنید پر مبنی ہوگا۔ وہ عارضی اور وقتی ہوگا۔

○

پیارو سوال مت بنو، جواب بنو۔

○

حق کو پانا ہے تو کتاب وشنید میں مت الجھو۔ رخ کو صحیح رکھ کر عمل کیے جاؤ۔ اس کا انعام علم واخلاص کی صورت میں ملے گا۔ اور یہ حق تک پہنچنے کا پہلا زینہ ہے۔

○

آدم زاد کی عقل جزوی ہے۔ وہ اپنے ہی دائرہ تک محدود ہے۔ اور اس کی ضروریات عقلِ کل سے بھی گذر کر عقلِ فعال تک پھیلی ہوئی ہیں۔

○

معاملات میں اپنے یا کسی کے حق کو پہچان لینا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ مالکِ کل حق کو پا لینا۔

○

جاگنے والے ہی تو جگاتے ہیں۔

○

اہلِ کتاب وشنید کے پاس بیٹھو گے تو مخلوق میں کیڑے دکھائی دیں گے۔ اور اگر اہلِ حق کے پاس بیٹھو گے تو اپنی ذات میں کیڑے دکھائی دیں گے۔

○

جب کوئی کسی کی برائی کرتا ہے تو وہ غیر کی بولی ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ ہمیشہ خیر کی بولی بولے۔ شیطان غیر ہے اور رحمٰن خیر۔ شیطان تخریب پسند ہے اور رحمٰن تعمیر کا خواہاں۔

○

جب کوئی شخصیت خدا کی بارگاہ میں مقبول ہو جاتی ہے تو اس کے دل کو شگفتگی اور زبان کو گویائی کا انعام عطا ہو جاتا ہے۔

○

دل کو حاضر اور خیر کے لئے آمادہ رکھو تاکہ اس میں غیر کا دخل نہ ہو۔

○

جو حکم میں رہتا ہے وہ حفاظت میں رہتا ہے۔

○

زیادہ کھانے سے جسم اور روح دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔

○

ہر قول مردہ ہے جس کا ثبوت عمل سے نہ دیا جائے۔

○

صاحب صفت کو پانا چاہتے ہو تو اس کی صفت کو اختیار کر لو۔ خدا اور رسول سے ملنے کا یہی طریقہ ہے، اور کوئی نہیں۔

○

طریقت کی بسم اللہ مادی غرض و غائت سے پاک ہونا ہے۔

○

قوم غرض و غائت کے انبوہ سے بنتی ہے۔ قرآن اور سنت سے قوم نہیں بنتی۔ قرآن اور سنت سے مومن بنتا ہے اور مومن ملت بناتا ہے۔ ملت سے وحدت تشکیل پاتی ہے۔

○

طلب دو طرح کی ہوتی ہے۔ ذاتی اور صفاتی۔
ذاتی طلب، ہوائے نفس ہے۔ اس کا ترک کرنا ضروری ہے۔ اور صفاتی طلب طلبِ شریعت ہے۔ اور یہ اس کا حصہ ہے جو اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے دلی تعلق نہ رکھے۔

○

جس نے اللہ تعالےٰ کو پہچان لیا اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔

○

ہر انسان کو ایک جوڑا اپنے پاس زائد رکھنا چاہئے۔ وہ اس لئے نہیں کہ کبھی اس کی اپنی ذات کے لئے ضرورت پڑ جائے بلکہ اس لئے کہ اگر کوئی صاحبِ حاجت آجائے تو اُسے مایوس نہ ہونا پڑے۔

○

مشاہدہ کامل ہے اور عقلی قیاسات ناقص ہیں۔

○

جب تم کسی میں کوئی عیب دیکھو تو اس کو اپنے اندر تلاش کرو اگر اُس کو اپنے اندر پاؤ تو اُسے نکال دو۔ دوسرے کی عیب جینی سے یہ بہتر ہے اور حقیقی تبلیغ ہے۔ اسے بزرگانِ دین تلاوت الوجود کہتے ہیں۔

○

جماعت میں کھڑے ہوئے ایسے صاحب استطاعت نمازی کو جس کے سوٹ کیس میں کپڑوں کا ایک جوڑا زائد ہے اور کچھ کھانا اس کی خوراک سے بچا ہوا ہے یہ علم نہیں ہے کہ اس کے دائیں بائیں ایک شخص بھوکا اور دوسرا پھٹے ہوئے کپڑوں میں کھڑا ہے تو اسے جماعت سے نماز پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ علیحدگی میں جہاں جی چاہے جا کر ٹکریں مار لے۔

○

اپنی ذات کے لئے صبر اور مخلوق کے لئے بھلائی ہے۔

○

نور ہدائیت کو کہا جاتا ہے۔

○

اگر کوئی بھائی ظالم ہو جائے تو اس کے ظلم میں شمولیت نہ کرو۔
لیکن اس کو ظلم سے بچانے کے لئے دعا کرنا اور ہر طرح کی کوشش کرنا آپ پر فرض ہے۔

○

جھوٹ وہ ہے جس سے خلقِ خدا کو نقصان پہنچے۔ ایسا سچ جس سے فتنہ برپا ہو حقیقتاً سچ نہیں ہے وہ جھوٹ سے بھی بدتر ہے۔ اور تکبّر ہے۔

○

لوگ ایک دوسرے سے میل جول اپنے فائدہ اور بھلائی کے لئے رکھتے ہیں لیکن بزرگانِ دین مخلوق سے میل جول ان کے فائدہ اور بھلائی کے لئے رکھتے ہیں۔

○

کسی بھائی کو بے غرض چاہنا مقامِ ولائیت ہے۔

○

مومن جہاں رہے خوشنودی اس کا مقام ہے۔ تکلیف اس کا آرام اور خدمت اس کی شان ہے۔

○

مخلوق کی بھلائی بزرگی کا جزو ہے۔ لیکن اس کی تکمیل کے لئے شریعت کا لباس ضروری ہے۔ ورنہ فلاح نصیب نہ ہوگی۔

○

لڑکوں کی پرورش اعمالِ نفس اور اعمالِ ذات میں سے ہے اور لڑکیوں کی پرورش اعمالِ دین یعنی اعمالِ خالص میں سے ہے۔

○

اللہ کے حضور سے جو چیز مانگ کر لی جائے اس میں مشقت ہوتی ہے۔ اور جو بن مانگے ملے وہ بغیر مشقت کے ملتی ہے۔

○

اللہ رب العالمین ہے اس نے پالنے کا وعدہ کیا ہے اور علم سے پالنے کا کیا ہے

○

قلب کی حفاظت کا ذریعہ عقل نہیں بلکہ بزرگانِ دین ہیں۔ البتہ جس عقل کی صداقت شاہد ہو وہ کامل ہے۔

○

تمام صفات اللہ سے ہیں اور اللہ اللہ والوں سے ہے۔

○

عمل کو علم کی آنکھ عطا ہوتی ہے اور خادم کو خدمت کی۔ اسی لئے مخدوم جب بنتا ہے خادم سے بنتا ہے۔

○

جاری کا لفظ جن مقامات پر استعمال ہوتا ہے ان میں فیض سب سے افضل ہے۔

○

کسی طرف لگنے کا مطلب لگن ہے۔ اور لگن کا نتیجہ اگن ہے۔ اگن سے آگیا پیدا ہوتی ہے۔ آگیا کا مفہوم ہوتا ہے آگہی۔ اور آگہی کے معنیٰ ہیں نعمتِ حق کی تکمیل۔

○

ہر مقام پر محبّ کو پورا رہنا چاہئے۔ پورا رہنے ہی سے نعمت کے شکریہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ یعنی دوسری نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے۔

○

اللہ تعالےٰ کا فضل محدود نہیں ہے۔ لامحدود ہے۔ اور ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔

○

جس کی پریت ہے اُسی کی جیت ہے۔ جس کا پیا اُسی کا جیا۔ اور وہی "جیا" یعنی زندۂ جاوید ہوگیا۔

○

نفس کی حقیقت غرض وغایت ہے۔ اور اس کا عمل فرقہ بندی یا پارٹی بازی ہے۔ اس کے لیئے نفس کے دو شاہد ہوتے ہیں۔ ہاتھ خائن اور زبان برائیوں پر آمادہ

○

عارضی وقت کو پکڑنا نہیں چاہئے اس میں خیر وخوبی نہیں ہوتی۔

○

سبب کا مالک رب ہے۔ اس لئے وہ مسبب الاسباب ہے جتنے نام رب کے اتنے ہی مقام سبب کے۔

○

جس شریعت کی رضا شاہد نہ ہو وہ شریعت حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ اس لئے کہ مومن کی شان شانِ تسلیم ہے۔

○

مسلمان جس وقت تسلیم کو قبول کرلیتا ہے اسی وقت اس کے عمل کی بنیاد پڑجاتی ہے۔

○

جو یائے حق کو عقل کے احاطہ سے صرف عمل ہی نکال سکتا ہے۔ اور کوئی نہیں

○

عمل علم کو جنم دیتا ہے اور علم اخلاص کو۔

○

قول عمل کے لئے دعوت ہے وہ بذاتِ خود علم نہیں ہے۔ علم تو عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

○

اللہ تعالےٰ تعیّن سے پاک ہے۔ لہٰذا اس کا کوئی رُخ نہیں ہے۔ البتہ پیارے کا جس طرف رُخ ہو اسی رُخ کو اللہ تعالےٰ پسند فرماتا ہے۔

○

بغیر دیکھے تسلیم نہ کرنے والا صدّیق نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک صدّیق نہ ہو اسے طالب کا درجہ عطا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے، طالب ہی کو مطلوبِ حقیقی یعنی حق مل سکتا ہے اور کسی کو نہیں۔

○

مبارک ہو ان لوگوں کو جنہیں یہ چار شاہد عطا ہوں، قول، اعمال، علم اور اخلاص۔

○

حشر میں ہر شخص کا پہلا گواہ اس کا ہمسایہ ہو گا اور دوسرا اس کا ہاتھ۔

○

"پورا" ہاتھ سے تعلق رکھتا ہے اور "سچا" زبان سے۔ دونوں جہان کی سربلندیاں پورے اور سچے کے لئے ہیں۔

○

جس کا ماضی پاک ہے وہ انسان ہے جس کا حال محبت ہے وہ صاحبِ ایقان ہے اور جس کا مستقبل شریعت ہے وہ اہلِ ایمان ہے۔

○

بے حقیقت وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو نہ پا سکے۔

○

توبہ کلید الاعمال ہے۔

○

جو لوگ اپنی بہتری اور فلاح چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ ان کے ساتھ مل جائیں جو اللہ تعالےٰ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔

○

عورت عارفِ دنیا ہے۔ اگر مرد عارفِ مولا نہ ہو تو دنیاوی امور میں اس سے کبھی پورا نہیں اتر سکتا۔

○

عقل و ہوش غرض و غایت کے اور غرض و غایت عورت کے ماتحت ہے۔ اور عورت مؤنث ہے۔ لہذا انسان اگر مقصود یعنی ذاتِ حق کو پا لے تو مرد ہے۔ اور مادّی غرض و غایت کو پا لے تو مؤنث ہے۔ اور اگر اس کا عمل خطا چلا جائے تو مخنّث ہے۔

○

نفس حرکات و سکنات تک کو نظر میں رکھتا ہے۔ اپنے کام کاج میں لگائے رکھنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔

○

قول بذاتِ خود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عمل اس کا شاہد ہو تو معنی موجود ہیں ورنہ نہیں۔ اسی طرح عقل کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تسلیم اس کی شہادت دے تو معنی موجود ہیں ورنہ نہیں۔ وہ اسلئے کہ عقل کا نتیجہ تباہی ہے۔ اور تباہی کے کوئی معنی نہیں

○

مومن جو بھی کام کرتا ہے۔ خواہ اس کی صورت دنیا کی ہو یا دین کی۔ اللہ ہی کیلئے کرتا ہے۔

○

دنیا کو چاہنے والا ہمیشہ خرابی کے پھیر میں رہتا ہے۔

○

کافر و مشرک کی یہ پہچان ہے کہ وہ دنیا چاہتا ہے اور اپنے ہی لئے چاہتا ہے۔ اسی لئے وہ ناپاک ہے۔

○

مومن اس لئے پاک ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی مادّی غرض و غایت نہیں رکھتا وہ اللہ سے جو کچھ لیتا ہے اس کی مخلوق کی بھلائی کے لئے ہی لیتا ہے۔

○

مال اہلِ توکّل کی نذر کرو کیونکہ وہ صاحبانِ نظر ہیں۔

○

بلند مرتبہ والے کے ساتھ رہنا اپنی مرضی سے وقت کو ضائع کرنا ہے۔

○

بزرگانِ دین کے ساتھ نماز ادا کرنی عمل اولیٰ ہے۔

○

جو انسان اپنی حفاظت نہیں کرتا اس کی کسی پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

○

بزرگانِ دین محبت کے تھوک بیوپاری ہوتے ہیں۔ وہ نفرت کا کھوٹا سکہ لے کر محبت اور خلوص کا کھرا مال دیتے ہیں۔ اور یہ بڑا نفع کا سودا ہوتا ہے۔

○

نور کے معنیٰ حیات ہیں اور نار کے معنیٰ موت۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ نور ہدایت ہے اور گمراہی نار۔

○

جو حال کو جنّت نہیں بنا سکتا وہ ماضی اور مستقبل کی آگ میں جلتا رہے گا۔

○

جو خیر کو خوشی سے قبول نہیں کرے گا وہ غیر کے جنگل میں جا پھنسے گا۔ وہ اس لئے کہ ان دو کے سوا کوئی اور مقام ہی نہیں ہے۔

○

مومن کی بسم اللہ، اللہ سے اور کافر کی ابتداء دنیا سے ہوتی ہے۔ جس کا آغاز اللہ سے ہو وہ پاک ہے اور جس کی ابتدا دنیا سے ہو وہ ناپاک ہے۔

○

مومن کا مستقبل بنا بنایا آتا ہے۔ کافر کا مستقبل تجویزی ہوتا ہے لہذا مومن مشقت سے پاک ہے اور کافر مشقت کے لئے مجبور ہے

○

محبت ہر مقام پر ایسے تعین سے پاک رہتی ہے جیسے مہندی کے پتے میں رنگ ۔ رنگ پتے پتے میں موجود رہتا ہے ۔ پتا تعین رکھتا ہے لیکن رنگ جو اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے تعین سے پاک ہے ۔

○

محبت محب سے ہے اور محب عرفان سے ۔

○

امین ہاتھ کو اللہ تعالے نے سارے جسم پر فوقیت بخشی ہے ۔ جس کا ہاتھ امین ہو جاتا ہے ۔ اس کا دل امین ہو جاتا ہے ۔ یعنی اُسے امانتِ حق عطا ہو جاتی ہے ۔ اور جس کا دل امین ہو جاتا ہے اس کا سارا جسم امین ہو جاتا ہے ۔ یعنی راہِ حق کے سوا وہ کسی راستہ میں قدم نہیں رکھتا ۔ اس کی تمام حرکات و سکنات نورِ حق کے لئے وقف ہو جاتی ہیں ۔

○

محبوب سے جو عطا ہو رہی ہے اس میں کوئی خطا نہیں ہے ۔ اگر اس میں خطا نظر آئے تو اُسے نظر کا قصور سمجھیں ۔

○

مسلمان کے ہاتھ سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا اور زبان سے کسی کی برائی نہیں ہوتی ۔

○

مرد کے دو ذاتی شاہد ہوتے ہیں وہ نہ تو اپنی مجبوری پر احسان کو بھولتا ہے اور نہ اپنی لطف اندوزی پر احسان کو بھولتا ہے ۔

○

انسان اس وقت گمراہ ہوتا ہے جب یہ سمجھ لے کہ میں ہی سب سے بہتر ہوں ۔ سب سے افضل وہ شخص ہے جو اپنے صحیح مقام کو پالے اور انکسار سے کام لے ۔

○

ایسے سامان کی خرید و فروخت کرنی چاہئے جو دنیا و آخرت میں کام آسکے اور وہ ہے صداقت ۔

○

شریعت ماضی ہے ، حقیقت حال ہے ، طریقت مستقبل ہے اور معرفت ان تینوں پر محیط ہے ۔

○

ہر صورت کا احترام واجب ہے جو جہاں ملے اسے سلام کر کے آگے گزرو ۔

○

جس صاحب نے اللہ تعالےٰ کا فرمان تسلیم کیا وہ صاحبِ فرمان ہوگیا۔

○

راہِ حقیقت میں عمل کی اوّلین شرط سوزِ الفت ہے۔ سوزِ الفت نہیں تو عمل نہیں۔

○

مجاز کی کھیتی کو چشمہ کا پانی دیا جاتا ہے اور حقیقت کی کھیتی کو چشم کا۔

○

دیکھنے میں یہی آئے گا کہ آم، انگور، کھجور، اور انار وغیرہ زمین سے طرح طرح کی صورتیں ظاہر ہوتی ہیں، حالانکہ اسم اور صفت سے پیارے نے ایک تعیّن کا پردہ ڈالا ہوا ہے۔

○

حقیقی حسن وہ نہیں ہوتا جو آنکھ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ صفات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور اسے محسوس کیا جاتا ہے۔ ظاہری حسن کو زوال ہے حقیقی کو نہیں۔

○

توبہ کے بعد راہ کی حقیقت باقی رہ جاتی ہے اور مسافت ختم ہو جاتی ہے۔ راہ کی حقیقت کیا ہے؟ ذاتِ حق ——— صرف ذاتِ حق!

○

مومن جہاں جائے صاحبِ حضور ہوتا ہے۔

○

جو لوگ اپنے لئے، اپنے علم کے لئے اور محض قول کے لئے بولتے ہیں ان کا بولنا خلقِ خدا کے لئے زحمت اور نفاق انگیز ہوتا ہے۔ جب بولو خدا کے لئے یعنی کسی کی فلاح کے لئے بولو۔

○

ولی نہ نماز کے سبب سے جنّت میں جائے گا نہ روزے کے سبب۔ اس کی نجات سخاوت، پاک دلی، نصیحت اور شفقت کے باعث ہوگی۔

○

سخی کی عزّت کی حفاظت خدا خود فرماتا ہے۔ اس کے پاس سائل اس وقت تک نہیں آتا جب تک سائل کا مقصود اس کے پاس بھیج نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ سائل کو بھیجنے والا اسلم سے بھیجتا ہے۔

○

شرک سے پاک ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ سبب سے دُور اور تعین سے پاک رہا جائے۔

○

لطافت سے نجابت اور کثافت سے خباثت ہے۔ انسانیت کی تعمیر کے لئے نجابت درکار ہوتی ہے اور اس کی تباہی کے لئے خباثت سبب بنتی ہے۔

○

غیر ایک طرف کا نام ہے۔ اور خیر دوسری طرف کا۔ جو انسان جس طرف کو تسلیم کرے گا وہی اس کی طرف ہوگی۔

○

محب کو نہ دکھ نظر آتا ہے نہ راحت، نہ دھوپ نظر آتی ہے نہ چھاؤں نہ کوہ نظر آتا ہے نہ مرغزار اگر وہ کسی کو دیکھتا ہے تو صرف محبوب کو اور اس کی بدولت ہر شئے کو دیکھتا ہے۔ یعنی ہر شئے میں اس کی جلوہ گری پاتا ہے۔

○

غیر کا حاصل غرور ہے اور غرور کا حاصل مادی غرض و غائیت۔ اگر غرض و غائیت کا حجاب اُٹھ جائے تو ہر جدوجہد عین دین بن جاتی ہے۔

○

عقیدہ قول کا نہیں ایک مقام کا نام ہے جو اللہ تعالےٰ اپنے پیاروں کو عطا کرتا ہے۔ اور جو ان سے پیار کرتا ہے اسے بھی اس نعمت سے نواز دیا جاتا ہے۔

○

کسی کی بدسلوکی کو سلوک نہ کرنے کا جواز نہیں بنانا چاہئے۔ اسی طرح کسی کے ظلم کو خود معاف نہ کرنے کا سبب نہیں ٹھہرانا چاہئے۔

○

کتاب ماضی ہے جو اس کے حافظ لگ جاتا ہے وہ بھی ماضی ہو جاتا ہے۔

○

مومن دنیا میں دوکاندار کی طرح رہتا ہے وہ اپنی ہر متاعِ نقد آخرت کے اودھار پر دیئے چلا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ جس سے وہ سودا کر رہا ہے وہ وعدہ کا سچّا ہے۔

○

قرآن پاک سالک کے لئے سواری کا حکم رکھتا ہے۔ اگر خیر کا رُخ ہو تو خیر اور اگر غیر کا رُخ ہو تو غیر کی طرف لے جائیگا۔

○

اللہ کے پیارو۔ وہ کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں۔

○

بولنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرو کہ اس میں دوسرے کا فائدہ ہے کہ نہیں، اگر ہو تو کلام کرو ورنہ نہیں۔

○

غوث، قطب اور ابدال وغیرہ سب درجات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن عاشق درجات والے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ سب سے بلند مقام ہے۔

○

بھیجنے والے نے انسان کو کسی عمل کے لئے بھیجا ہے۔ حرف پڑھنے پڑھانے کے لئے نہیں۔ جو لوگ پڑھنے پڑھانے کو عمل سمجھتے ہیں وہ ناآشنائے حقیقت ہیں۔

○

عقل جب دکھاتی ہے اپنا گھر دکھاتی ہے اور عشق جب دکھاتا ہے غیر یعنی محبوب کا گھر دکھاتا ہے۔

○

تمام کائنات کی ابتداء قول سے اور بزرگانِ دین کی بسم اللہ عمل سے ہوتی ہے۔

○

اللہ کے پیارو! اللہ کی نزدیکی چاہتے ہو تو اپنے اخلاق سنوار لو۔

○

تم اللہ کے ہو جاؤ اللہ تمہارا ہو جائے گا۔

○○◯○○

انجام کار

○

حقائق کو اپنے مطابق کر لینا جہانگیری ہے۔ اور حقائق کے خود مطابق ہو جانا جہانبانی ہے۔

○

(اعلیٰ حضرت سلطان الحقیقت)

اهم نوٹ

ے جملہ حقوق آستانۂ قادریہ، انفنٹری روڈ
لاهور کے مکتبۂ عرفان کے پاس محفوظ هیں
ب کو پیش کرنیکے لئے اپنے اس معاصر
ون کے لئے شکر گزار هیں -

مہتمم
ادبستان - لاهور